پروین شاکر کی شاعری کا تنقیدی جائزہ
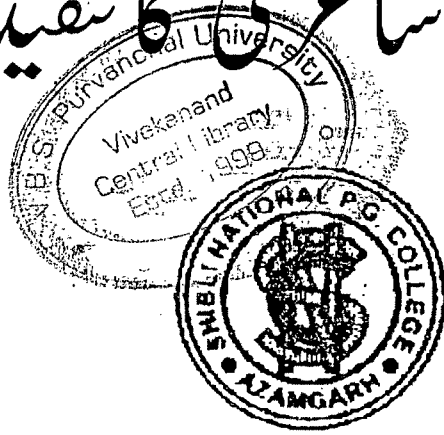
مقالہ برائے پی. ایچ. ڈی.

مقالہ نگار
شاہد نوخیز

نگراں
ڈاکٹر محمد طاہر

شعبۂ اردو

شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

ملحق

ویر بہادر سنگھ پروانچل یونیورسٹی جونپور، یوپی۔ ۲۰۰۶ء

Department Of Urdu
Shibli National College
Azamgarh (U.P.)
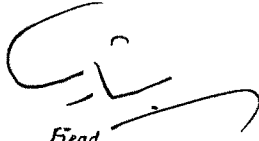
شعبہ اردو
شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ
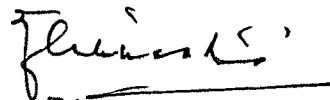
Certificate

This is to certify that Mr. Shahid Naukhez has completed his Ph.D. thesis entitled "PERVEEN SHAKIR KI SHAIRI KA TNQUEEDI JAIZAH" under my supervision.

It's further certified that it's an original work and it has not been previously or presently submitted to any other university for any other degree as per my knowledge.

Head
Department of Urdu
Shibli National P.G. College
AZAMGARH.

Dr. Mohd. Tahir
SUPERVISOR
Department of Urdu
Shibli National P.G. College
Azamgara.

Principal
Shibli National College
Azamgarh

فہرستِ ابواب

کلیدِ حرف

کلیدحرف

تخلیق کی دیوی پروین شاکر نے اپنی شاعری اور شخصیت سے سرزمین اردو کو معطر اور آسمانِ ادب کو منور کیا۔ ''خوشبو'' اس کا شعری استعارہ بھی ہے شعری شناخت بھی اور حسن کی تکمیل بھی کیونکہ اس کے مطابق حسن جب لطافت کی آخری حدود کو چھو لے تو خوشبو بن جاتا ہے، محبت جب تقاضائے جسم و جاں سے ماوراء ہو جائے تو الہام بن جاتی ہے اور وجود کو جب محبت کا وجدان ملا تو شاعری نے جنم لیا۔ بچشم باطن دیکھیں تو یہ راز کھلتا ہے کہ شاعری موسیقی اور مصوری ایک بے جان جسم ہے۔ جس میں فنکار کی روح سچے سروں کے ساتھ سرایت کر جائے تو یہ جگمگا اٹھتی ہے شاعری بولتی تصویر اور مصوری پُر رونق شاعری بن جاتی ہے اور ان کا سراپا موسیقی کا روپ دھار لیتی ہے جس کے تار حرف کو روشنی بھی دیتے ہیں اور جسم کو تازگی بھی یہی وہ اوصاف ہیں جو پروین شاکر کی شاعری میں اپنے سچے سروں کے ساتھ حرف کی روشنی میں یکجا ہو گئے ہیں۔ جہاں خوشبو کھلتی ہوئی کلی کی مسکراہٹ بھی ہے اور مرجھائے ہوئے شگوفے کا نوحہ بھی، ہوا زندگی کا وجود بھی ہے اور طوفان کی آمد بھی، تقویت کا راستہ بھی اور اذیت کا پیش خیمہ بھی، کلی کے کھلنے کی علامت بھی اور پھولوں کو حریص ناخنوں سے نوچ لینے کا اعلان بھی۔ جہاں بیداری پر درد کرتی ہے اور آگاہی رخ زرد کرتی ہے اور زندگی کا ہر زینہ سمتِ نامعلوم کی جانب تیزی سے گامزن ہے۔ ''صد برگ'' کے سائے اور ''خود کلامی'' کے فیصلے جنہیں

روکنے یا ساتھ چلنے سے قاصر ہیں۔ جب اس تیز روی کے تھپیڑوں سے آنکھ کھلتی ہے تو انسان اپنے آپ کو جنگل میں پاتا ہے اور پیر غائب ہوتے ہیں۔ جہاں بھیڑیوں مادرزاد منافقوں اور مفادی ہرکاروں کی ایک بھیڑ ہوتی ہے جس کے آئین میں صورت، سیرت اور سوچ رکھنا جرم عظیم ہے۔ اس جرم میں دربدری کا فیصلہ صادر ہوتا ہے اور زندگی راندۂ درگاہ ہوتی ہے۔ وجود گزشتہ خواب، موجودہ عذاب اور مستقبل کے سراب میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ کفِ آئینہ کے آئینہ میں اس آئین کا انکار اور زندگی کے نشیب وفراز کی تشریح ہی پروین شاکر کی شاعری کا خاصہ ہے۔ میرا مقالہ انہیں سچوں اور صلیبوں کی داستان کی تشریح وتفسیر ہے۔ جو شاعرہ کی زندگی کی بیالیس صلیبوں پر معلق اور سات ابواب پر محیط ہے۔ جس نے ڈاکٹر محمد طاہر صاحب کے زیرنگرانی تکمیل کی دہلیز تک رسائی حاصل کی۔ اس مقالہ کی کمیوں، خرابیوں اور کوتاہیوں کا میں بقلم خود اعتراف کرتا ہوں اور کسی کا شکریہ کہہ کر اسے اپنے جرم میں ملوث نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اسطرح کے مقالہ میں کسی کا شکریہ ادا کرنا محرّم کی مبارکباد دینے کے مترادف ہوگا۔

شاہد نوخیز

باب اول

شاعرات کا تاریخی پس منظر

ملک عرب اور اس کا تمدن بہت ہی قدیم ہے لیکن شاعری کے آثار اسلام کی آمد سے چند سال پہلے سے ہی ملتے ہیں۔ عربی کا پہلا شاعر مہلہل ہے جو کہ مشہور شاعر امرءالقیس کا ماموں تھا اور امراءالقیس کا زمانہ حضور اکرم ﷺ سے چالیس سال قبل کا تھا امراءالقیس کی شہرت ومقبولیت کے بعد عربی شاعری مختلف قبیلوں میں تیزی سے پھیلی زمانے کے اعتبار سے شعراء عرب کے چار ۴ دور ہیں۔

جاہلی: یعنی اسلام سے قبل کے شعراء

مخضرمی: یعنی جنہوں نے دونوں زمانے پائے۔

اسلامی: یعنی آنحضرت صلعم کے زمانے سے لیکر بنو امیہ تک

محدث: یعنی دولت عباسیہ کے شعراء اوران کے مابعد

اس پس منظر میں اگر آپ دیکھتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جب سے عربی شاعری کا آغاز ہوتا ہے یا عربی کے مشہور شاعر تک رسائی ہوتی ہے ٹھیک اسی وقت سے شاعرات بھی دکھائی دیتی ہیں۔ یعنی دور جاہلیت سے ہی عربی شاعری میں شاعرات کی بھی ایک طویل فہرست ملتی ہے جس میں خرنق بنت بدر لیلی العفیفہ، جلیلہ بنت مرہ، ام الصریح، عاتکہ بنت عبدالمطلب، صفیہ، ہند بنت حارث، ام ایمن مھشور شاعرہ ہیں جن میں خنساء کا مقام سب سے بلند ہے۔

خنساء: خنساء کو عربی شاعری میں ''حوا'' کی حیثیت ہے دور جاہلیت سے دور جدید تک کوئی بھی شاعرہ ایسی پیدا نہیں ہوئی جس کو خنساء کے ہم پایہ یا ہم پلہ کہا جا سکے۔ خنساء کا اصلی نام تماضر بنت عمرو بن الشرید سلیمیّہ ہے خنساء اس کا لقب تھا شرافت کے کاخ بلند میں اس کا جنم ہوا اور گلستان فضیلت میں پلی بڑھی اس کے باپ اپنے قبیلہ بنو سلیم کے سردار تھے خنساء کو حسن وادب پر دسترس حاصل تھی خنساء کی زندگی کا سب سے پہلا

واقعہ جس کا ذکر اس کے سوانح نگار کرتے ہیں۔ایک معمر شخص درید بن الصمہ کا پیغام نکاح تھا یہ خنساء کے بھائی معاویہ کا گہرا دوست تھا۔خنساء کو پیام نکاح پر غور کرنے کا موقع دیا گیا اور جب اس نے درید کو دیکھا تو ناپسندگی کا اظہار کیا اور اس کے خلاف چند اشعار بھی کہے جس میں خنسا نے اس پر اور اس کے قبیلہ پر طنز بھی کیا اور یہ بھی کہا کہ اس نے اس سے پہلے بدر کے خاندان کے ایک فرد سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

خنساء نے اپنے قبیلے کے ایک دوسرے شخص مرداس بن ابی عامر (السلمی) سے شادی کی جس سے اس کے تین بیٹے زید، معاویہ، عمرو اور ایک بیٹی عمرہ بھی پیدا ہوئی جو اس کی سب سے چھوٹی اولاد تھی لیکن بقول ابن حزم مرداس کے ان تین بیٹوں کا نام ہبیرۃ، جزو اور معاویہ تھا۔(جمہرۃ النساب العرب ص ۲۶۳)

جس واقعہ نے خنساء کی زندگی کا رخ بدل دیا وہ ان کے دو بھائیوں کی موت تھی جن کا نام معاویہ اور صخر تھا۔ان بھائیوں کی موت پر انہیں بہت تکلیف ہوئی۔انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ ان کے رنج وغم میں گزارا اور نہایت پر درد اور پر اثر مرثیے کہے۔ اس طرح ان کی زندگی مسلسل آنسوؤں میں گزری۔ انہوں نے بہت انقلاب دیکھے اور مایوسی ان کے گھر میں ڈیرا ڈال کر رہی۔وہ آنحضرت کے پاس آئیں اور اسلام قبول کر لیا اور جب انہوں نے اپنے اشعار حضورؐ کو سنایا تو انہوں نے بھی پسند کیا تاریخ ادب عربی میں اس واقعہ کے متعلق سیّد طفیل مدنی لکھتے ہیں۔

حضورؐ کو اس نے اپنے اشعار سنائے تو آپ جھومنے لگے اور مزید سننے کا شوق یہ کہتے ہوئے ظاہر فرمایا

''اور سناؤ اے خناس''۔(۱)

اسلام قبول کرنے کے بعد بھی خنساء طرز جاہلیت پر اپنے باپ اور بھائیوں پر روتی دھوتی رہیں اور برابر مرثیے کہتی رہیں۔وہ کہتی تھیں کہ پہلے میں بدلہ لینے کے لئے اس پر روتی تھی اور آج میں اس کے جہنم میں جانے کی وجہ سے اس پر روتی ہوں لیکن جب مذہب اسلام کے اثرات ان پر غالب آئے تو انہوں نے اس رسم

جاہلیت سے گریز کیا اور صبر وسکون کی خواہاں ہوئیں اور سکون وصبر سے اپنے سارے بیٹوں کی شہادت کی خبر سنتی رہیں اور ان کے منھ سے صرف یہ ہی نکلتا کہ خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ان کی شہادت سے عزت بخشی اور میں امید کرتی ہوں کہ وہ مجھے ان سے ملا دے گا۔ خنساء نے ۲۴ھ میں بادیہ میں وفات پائی انہوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی کہ لڑائی سے بیٹھ نہ پھیرنا، لڑائی شروع ہوتے ہی بیٹے اپنی ماں کی نصیحت اور وصیت کو باآواز بلند رجز میں کہتے ہوئے یکے بعد دیگرے آگے بڑھے اور شہید ہوئے تو بولیں "الحمد لله الذی شرفنی بنعلهم" خنساء کے مرثیہ کا نمونہ پیش خدمت ہے۔

يذكر نى طلوع الشمس صخراً واذكره لكل غروب شمس
ولولا كثرت الباكسی خولی على اخواتهم لقفلت لنفسی

مذہب اسلام نے خنساء کے آنسوؤں کے دریا کو خشک کر کے پہاڑ جیسا صبر وثبات عطا کیا۔ پوری طویل زندگی انہوں نے بے سہارے اور بے یار و مددگار گزاری لیکن کبھی اف تک نہیں کیا جب کہ شوہر بھائیوں اور بیٹوں کے بعد بھی وہ تنہا ہو کر رہ گئی تھیں اور ان امتحانوں اور آزمائشوں میں ان کا ایمان نہ صرف پختہ رہا بلکہ پختہ تر ہوتا گیا۔ یہی وہ سادگی اور برجستگی تھی جو دیگر شعراء یا شاعرات میں نہیں پائی گئی اس لئے تمام علماء ادب اور نقاد اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ شاعرات میں دور جاہلیت اور اسلام دونوں میں بھی خنساء سے بڑی کوئی شاعرہ نہ تھی اور نہ ہی اس کے بعد پیدا ہوئی۔ اس خصوصیت کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حضورؐ نے جن چند شعراء کی تعریف کی ہے ان میں خنساء کا نام سرفہرست ہے۔ آپؐ خنساء سے بھی خنساء کچھ سناؤ کہکر اشعار سنتے تھے۔ خنساء کے متعلق نابغہ، جریر اور بشار کا خیال ہے کہ وہ مردوں سے بھی بہتر شاعری کرتی تھی اس لئے کہ اس کی شاعری میں مردانہ زور بیان اور زنانہ رقت وسوز یکجا ہیں۔ متانت شعر، نزاکت لفظ اور حلاوت صوت میں خنساء اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ صاحب نظر اور دقیق بین ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ شاعرہ بھی ان کا دل

دکھوں سے بھرا اور زندگی آنسوؤں سے تر بہ تر تھی۔ سوز، کسک اور درد انکی شاعری کے زیور تھے جو ٹوٹے ہوئے دل اور بکھری ہوئی شخصیت پر نوحہ کناں تھے۔ ان کی بحریں چھوٹی چست اور چنیدہ الفاظ میں ہوتی تھیں۔ جس کی وجہ سے آشعار میں نغمگی اور موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے اس دور کے منفرد اور مشہور شاعر جریر سے جب پوچھا گیا کہ بڑا شاعر کون ہے؟ تو بولا!

''میں اگر خنساء ہوتی کہا گیا کہ وہ تم سے کس طرح بازی لے گئی بولا اپنے اس شعر سے''

ان الزمان ومایضی له عجب　　ابقی لنا ذنباً واستو، صلی الناس

ان الجدیدین فی طول اختلافهما　　لایفسد ان ولکن یفسد الناس (۲)

خنساء کا بیشتر کلام مرثیہ پر مشتمل ہے جو انہوں نے اپنے دو بھائیوں معاویہ اور صخر کے قتل کے بعد کہا لیکن دونوں بھائیوں کے مرثیوں میں بھی معانی و مطالب کا فرق صاف نظر آتا ہے۔ معاویہ کے مرثیہ میں بھاری بھرکم الفاظ کا الفاظ ہوا ہے جس میں وہ انداز گریہ نہیں جو صخر کے مرثیوں میں ملتا ہے جس کو پڑھ کر انسان نڈھال اور آنکھیں اشکبا ہو جاتی ہیں اور زندگی موت کی خواہاں وتمنائی بن کر اپنے دن گزارتی ہے صخر کے مرثیہ کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

اعینّی جود او لا تجمرا　　الا تبکیان لصخرا لنّدی؟

الاتبکیان الجرئ الجمیل　　الا تبکیان الفتی السیّدا؟

رفیع العماد، طویل النجا　　د، ساد عسیر ته امردا

اذا القوم مدّو ا أیادیهم　　الیٰ المجرِ مدّ الیه یدا

فنال الذّی فوق أیدیهم　　من المجدتم اتمی مصبرا

یحمّله القوم ماعالهم　　وان کان أصغر هم مولوا

وان ذکر المجد الفیته　　تازّربا الجدتم ارتدا

خنساء کے دیوان کے متعدد نسخے مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں جن میں بعض کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱) دیوان الخنساء: المطبعۃ الوطنیۃ مصر ۱۳۰۵ھ بمطابق ۱۸۸۸ء

(۲) دیوان الخنساء: القاہرہ ۱۳۱۵ھ

(۳) انیس الجلساء فی شرح دیوان الخنساء المطبع الکاثولیکۃ بیروت ۱۸۹۶ء

اپنے پیاروں دلاروں اورعزیزوں کو گنوانے والی یہ شاعرہ طویل عمر صرف رونے دھونے اور گریہ کرنے میں گزارنے کے بعد بالآخر اپنی ہی قوم کی جائے رہائش بادیہ ۲۴ھ کو اپنے عزیزوں سے جاملی۔ اور شاعری کا ایک روشن ستارہ ہمیشہ ہمیش کے لئے سپرد خاک کر دیا گیا لیکن ان کی شعری کرنیں تا قیامت عربی ادب کو منور کرتی رہیں گی۔

دور جاہلیت سے دور جدید تک کی شاعری میں شاعرات کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا اور ہر دور میں خواتین کا عربی زبان و ادب کے فکری و اسلوبی ارتقاء میں اہم رول رہا ہے جن میں عزیزہ ہارون و دادسکا کین، فلک طرزی، فدوی طوقان، سلمیٰ خصرا، غادۃ الصحرا، ثریا قابل، رقیہ ناظر، ڈاکٹر فاتنہ شاکر، ڈاکٹر مریم بغدادی وغیرہ کا نام جدید شعر وادب میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں نازک الملائکہ اپنی مثال آپ ہیں۔

نازک الملائکہ: انہیں شاعرات میں ایک اہم اور نا قابل فراموش نام نازک الملائکہ کا بھی ہے جس نے اپنے پہلے ہی شعری مجموعے سے ادبی دنیا میں حرکت ہی نہیں ہلچل مچادی اور اسکی الگ شناخت قائم ہوئی۔

نازک ۱۹۲۳ء میں ممتاز علمی خانوادہ بغداد میں پیدا ہوئیں ان کے والد صادق الملائکہ اور والدہ مکرمہ ام نزار بھی شعروادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ عربی زبان وادب کے ساتھ ساتھ مغربی زبان سے بھی نازک نہ صرف آشنائی رکھتی تھیں بلکہ انہیں اسمیں دسترس بھی حاصل تھی جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں انگریزی ادب کا گہرا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ کہیں اس ادب کو وہ عقیدت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں تو کہیں نفرت کی نگاہ سے یعنی اس کی خوبیاں اخذ کرتی ہیں اور خرابیوں سے گریز اور پرہیز بھی کرتی ہیں۔

نازک کے تینوں شعری مجموعوں نے کافی شہرت حاصل اور جدید عربی شاعری میں ان کی کافی پزیرائی ہوئی۔ عاشق اللیل ۱۹۴۷ء شظایا ورماد ۱۹۴۹ء قرارۃ الموجہ ۱۹۵۷ء میں منظر عام پر آیا انہیں مجموعہ کلام سے ان کی شاعری کی گہرائی وگیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان مجموعۂ کلام کے علاوہ ان کے کلام مختلف ادبی مجلّات میں بھی بکھرے پڑے ہیں جو ان کے مشہور شاعرہ ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ نازک کی شخصیت اور شاعری کا باریکی سے مطالعہ کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی انتہائی پریشانیوں دشواریوں اور آزمائشوں میں گزری۔ اس کو کبھی بھی سکون وآرام میسر نہیں ہوا۔ دراصل اس کی شاعری اس کی سرگزشت ہے، آپ بیتی ہے، آنسوؤں میں لپٹی ہوئی اور شعلوں میں جلتی ہوئی اس کی شاعری ہی اس کی شخصیت کی غماز ہے نازک کی زندگی کے اس نشیب و فراز کے متعلق عبدالحق حقانی رقمطراز ہیں۔

''نازک کی زندگی ماں کی وفات، والد کی جدائی، عزیزوں کی رحلت کی وجہ سے عذاب بن گئی۔ ان

سیاروں کے بغیر زندگی کے سمندر کو پار کرنا بڑے بڑے سورماؤں کے لیے دشوار ہوتا ہے تو پھر نازک ایک عورت تھی وہ کیسے غم کے ان پہاڑوں کو برداشت کرتی اس لیے رات کی تنہائیوں میں جب کچھ سوچتی ہے تو یہ سارے واقعات نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ رقیق القلب شاعرہ رونے لگتی ہے اس کی دنیا رنج وغم سے آباد ہو جاتی ہے پھر یہی کیفیت شعری قالب میں ڈھل جاتی ہے اور آنسو لفظوں کا روپ دھار لیتے ہیں پھر اسے اپنی بے وجودیت اور لاشئیت کا احساس ہونے لگتا ہے اور زندگی خواب وخیال نظر آتی ہے اور اسے اپنا وجود صرف ایک سایہ کے مانند نظر آتا ہے اور کبھی وہ زندگی کے طلسمات سے دور بھاگ کر ایسی جگہ پناہ لینا چاہتی ہے جہاں تنہائی ہو، خواب ہو، خیال ہو۔'' (۳)

نازک کو ان پریشانیوں نے اس قدر شکستہ کر دیا تھا کہ وہ حقیقی دنیا اور حقیقی زندگی سے راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتی اور صرف خواب وخیال کی باتیں کرتی۔ یہی اس کی شاعری میں بھی غالب ہے وہ بار بار تنہائی، وحشت، خوف، اندھیرا، شکست اور موت کے الفاظ استعمال کرتی ہے گویا یہی وہ الفاظ ہیں جن سے نازک اپنی شاعری کا تانا بانا بنتی ہے۔ اپنے تمام مجموعوں میں وہ اس فانی زندگی کا ماتم کرتی ہے اور بار بار اپنی بے ثباتی اور تنہائی کا ذکر کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے۔

''دن گزر رہے ہیں، روشنی بھی ختم ہو رہی ہے، ہم تو خوابوں میں بھی ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔
میں اکیلی ہوں، کبھی کھڑکی کے شیشے سے اور کبھی دروازے کے پیچھے سے تاریکیوں کے نقوش ڈھونڈتی ہوں۔
دن گزر جاتے ہیں اور میں اکیلی ہوں۔''

اپنی تنہائی، پسپائی اور حیرانی پر اس انداز میں ماتم کرتی ہیں۔

اللیل یسأل من أنا

أنا سرۃ القلق العمیق الاسود

''رات پوچھتی ہے میں کون ہوں میں تو میں اس کی سیاہ گہری پریشانی کا راز ہوں''

ہوائیں پوچھتی ہیں میں کون ہوں؟ میں اس کی حیران روح ہوں جس کا زمانے نے انکار کیا میں اسی کی طرح آوارہ ہوں۔ بغیر کسی منزل مقصود کے سفر کرتی ہوں۔ زمانہ مجھ سے پوچھتا ہے میں کون ہوں؟ میں اس کی طرح ایک عفریت ہوں جس نے صوبوں کو پار کرلیا ہے۔ میں ماضی بعید کو جنم دیتی ہوں اور پھر اسے لوٹا دیتی ہوں اور اپنے لیے ایک نیا کل ڈھونڈھتی ہوں جس کا آنے والا کل منجمد ہوتا ہے۔ میری ذات مجھ سے سوال کرتی ہے کہ میں کون ہوں؟ میں اسی طرح حیران و پریشان ہوں سالوں تاریکیوں میں جھانکتی رہتی ہوں کوئی بھی چیز مجھے امن وسکون عطا نہیں کرتی۔

نازک اگر کسی سے ملاقات کا خواب بھی دیکھتی ہیں وہ خواب ہی ہو جاتا ہے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اور شکست خوردہ ہو کر کہتی ہیں۔

وما كنت اعلم افك ان غبت خلف السنين   تخلف فلك فى كل لفظ رخى كل معنى

''اگر تم ایک دن آئے تو میں ہمیشہ اس بات کو ترجیح دوں گی کہ تم کبھی نہ آؤ۔ میری یادوں کی خوشبو ختم ہو جائے گی اور تخیل کے پر کتر دیے جائیں گے۔ میرے گیت برباد ہو جائیں گے۔ میں تم کو ایک خواب کی طرح چاہتی ہوں اور جب کبھی تم ایک مجسم شکل وصورت میں میرے سامنے آؤ گے میں شاید ہی اپنے حواس برقرار رکھ سکوں گی۔''

نازک کی شاعری میں نازک خیال بھی ہے اور برجستہ گوئی بھی، نوحہ بھی ہے اور طنز بھی، قدیم امنگ بھی ہے اور جدید کے رنگ بھی، فکری بلندی بھی اور جذباتی امنگ بھی، قافیہ کی بندش بھی اور نظم کی آزادی بھی، جدید استعارے بھی اور انوکھی تشبیہات بھی، سادگی بھی شیرینی بھی، جذبات کا الجھاؤ بھی الفاظ کا بہاؤ بھی۔ یعنی نازک کی شاعری ایک ایسا سنگم ہے جہاں آزاد روی تو ہے لیکن بے راہ روی نہیں ہے۔ جدید عربی شاعری انہیں

مضبوط اور مقدس ستونوں پر ایستادہ ہے جس سے وہ مقصدیت میں کامیاب بھی ہوتی اور روایات کا دامن بھی نہیں چھوٹا اور بعد کی شاعرات نے انہیں کو اختیار کرتے ہوئے عربی شعر و ادب میں گراں قدر کارنامہ انجام دیا جن کے نقوش پوری ادبی دنیا میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ خنساء کی سربراہی میں چلنے والا یہ کارواں آہستہ آہستہ منزل مقصود کی طرف گامزن ہے اور نازک اسی کارواں کی ایک مضبوط ترین کڑی ہیں۔

غادۃ الصحرا: جدید سعودی شاعرات میں سب سے ممتاز نام غادۃ الصحر اکا ہے لیکن افسوس کہ اس مشہور ترین شاعرہ کے احوال وکوائف پر تمام تذکرہ نگار خاموش ہیں۔ جس سے اس کی شخصیت پر دبیز پردا پڑا ہوا ہے جس سے اس کی ابتداء وارتقاء کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ قیاس پر مبنی ہے جب کہ اس نے اپنے خیالات ونظریات، افکار اور شعری کاوشوں کا ادبی وعلمی دنیا پر گہرا نقش چھوڑا ہے۔ مشہور موّرِخ ادب الشیخ بکری امین نے اپنی مشہور کتاب ''الحرکۃ الادبیہ المملکۃ العربیہ'' غادۃ الصحر اء کے بارے میں صرف اس قدر مختصر لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔

''یہ ایک شاعرہ کا رمزی نام ہے اصلی نام نہیں۔ شاعرہ کسی معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اس کی شخصیت پر ہنوز اسرار کا پردہ پڑا ہوا ہے لیکن اس میں شک نہیں اس خاتون کو فیاضی کے ساتھ شاعرانہ صلاحیت قدرت نے عطا کی ہے۔ تاریخ ادب میں اس کا تذکرہ عصر حاضر کی بلند پایہ غزل گو شاعرہ کی حیثیت سے کیا جائے گا۔''

اس کی غزلوں میں غزل کی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ سوز، کسک، تڑپ، دید، تشنگی اور خواہشات کا لفظ بار بار استعمال ہوتا ہے۔ بندش، تشبیہ اور استعارے کا بھی بہترین استعمال ہے۔ چھوٹی بڑی دونوں بحریں پائی جاتی ہیں۔ ان کی پوری شاعری میں ایک تشنگی اور پیاس کا احساس ہوتا ہے اور ان کی خواہشات دم توڑتی نظر آرہی ہیں۔ ان کی خواہشات کے بادل چمک گرج کر اٹھتے ضرور ہیں مگر بغیر برسے ہی چلے جاتے

ہیں۔ ان کی پرامید نگاہیں ترستی ہوئی ان کا تعاقب کرتی ہیں۔ لیکن بے بس ہی رہتی ہیں اور زندگی کا جنگل پیاسا، ویران اور حیران ہی رہ جاتا ہے اور یہی ویرانی و پریشانی، تشنگی اور خشکی ان کی تمام کلیوں کو پژمردہ کردیتی ہیں اور زندگی خوشی یا خوشگواری کے ایک پھول سے محروم دکھائی دیتی ہیں۔

ان کی محبت کی خوشبو بھی انہیں حالات کی نذر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے لطف و نوازش کو محض اپنے تک ہی محدود رکھنے کی متمنی دکھائی دیتی ہیں۔

لیت حبیبی یصیر حبّی　　　حبّی لایعرف الحدود

ایک دوسرے شعر میں کہتی ہیں

بلاد موع بلاذل علا غصص　　　والحب أو جعد ما کان کتمانا

''یعنی جس محبت میں آنسوؤں، خواریوں اور غم واندوہ کا اظہار نہ ہو سکے اس کو پوشیدہ رکھنا، اف.....کتنا اذیت ناک ہے۔''

لیکن انہیں غموں اور آنسوؤں کی نمیوں نے وہ گل کھلائے کہ ہر نگاہ انہیں کی طرف اٹھنے لگی اور ہر بشر ان کے اس روگ کے بارے میں جاننا چاہتا ہے کہ آخر یہ کون سا درد ہے جس میں آنسو اور خوشی کی لہریں ایک ساتھ اٹھتی ہیں۔ کیفیت کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں۔

''میری سہیلیوں نے مجھے بدنام کرنے کو یہ خبر اڑا دی کہ تم میرے ہو۔ کیا میں ان کی خبر کی تردید کروں جس میں میرے غم ہلکے ہو گئے ہیں؟ مجھے صاف صاف بتا دو کیونکہ اب حیرت میرے وجود میں درد بن چکی ہے۔ اڑ کر میرے پاس پہونچ کر میرے ندیم بن جاؤ میں تم پر قربان ہو جاؤں گی۔''(۴)　(دیوان شمیم العرار)

ان کی شاعری میں فطرت کی عکاسی، قدرتی مناظر کی کشش صحرائی زندگی کی سادگی اور مشقت اپنے وجود میں صحراء کی تپش کی بہترین ترجمانی ملتی ہے اپنے دیوان کے صفحہ ۹۰ پر ایک غزل میں وہ اپنی ہستی کو فکروں

بھری رات اورصحراء کی تپش میں بھٹکنے سے تعبیر کرتی ہیں۔ جہاں نہ کوئی شجر سایہ دار ہے نہ شبنم کے قطرے ہیں بس محبت اوراس کی مہک ہے اس وسیع صحراء میں نہ کہیں پانی گرنے یا بہنے کی آواز ہے نہ اس کا تصور، نہ خیموں میں چاندسورج کا گزر، مونس ومددگار ایک تیز دھاروالی تلوار ہے۔

غادۃ الصحر اءکی زندگی بھی خنساءاور نازک کی طرح پریشانیوں میں گزرتی نظر آرہی ہے۔ ان کے شعری کائنات پر نظر ڈالی جائے تو تلخی، محرومی، حرماں نصیبی اور مایوسی کے ساتھ ساتھ آنسو، نوحہ، درد، فکر تشنگی، پسپائی اور خود کلامی کا انبار لگا ہوا ہے اور ان کی شاعری لق ودق صحراء کے ایک مسافر کی زندگی معلوم ہوتی ہے۔ جس کو نہ منزل کا پتہ ہے نہ راستے کا، قدم چلنے نہیں دیتے اور بے چینی رکنے نہیں دیتی۔ دل ودماغ میں ایک کشمکش ہے اور وجود خانہ جنگی کا شکار ہے۔ عربی شاعری کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ان کی زندگی اور شاعری لبنانی شعراء سے کافی قریب ہے۔ اس کے متعلق شباب الدین صدیقی رقمطراز ہیں۔

غادۃ الصحر اکا کلام لبنانی شعراء سے اس حد تک متاثر ہے کہا جاتا ہے کہ ان کے یہاں نجد کی روح ہے۔ اس کی وادیوں اور نخلستانوں اور صحراء کے ماحول کے علاوہ سب کچھ لبنانی ہے۔ خصوصاً ان کی شاعری کا سرگوشی کا انداز قصائد کی ہیئت اور اوزان وقوافی سب کچھ لبنانی شعراء سے متاثر ہیں۔ غادۃ الصحر اء کے دوشعری مجموعے ''شمیم العرار'' اور عینائی ۱۹۶۴ء میں بیروت سے طبع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔'' (۵)

ثریا قابل: سعودی کی جدید عربی شاعرات میں ثریا قابل کا نام انتہائی اہمیت کا حامل ہے جن کا تذکرہ عبدالسلام الساسی نے الموسوعۃ العربیہ میں اس طرح کیا ہے۔''

ان کی پیدائش ۱۹۴۰ء میں جدہ میں ہوئی ان کا شمار چند اولین تعلیم یافتہ سعودی خواتین میں ہوتا ہے جن کی اعلیٰ تعلیم نصف صدی قبل بیروت کے "كلية الاهميه" میں مکمل ہوئی۔ قاہرہ میں ایک صحافی اور مقالہ نگار کے علاوہ انہوں نے اپنے اشعار کی وجہ سے شہرت ومقبولیت حاصل کی۔ ان کی شاعری موزوں اور اوزان وقوافی

سے آزاد دونوں طرح کی ہے۔ ان کی کا شعری دیوان ''الاوزان الباکیۃ'' ۱۹۶۳ء میں منظر عام پر آچکا ہے جس میں وطن کے اہم مسائل پر ان کے قلبی احساسات کی ترجمانی ہے۔ خصوصاً وہ نظم بہت ہی اثر انگیز ہے جو انہوں نے عظیم مجاہدہ جمیلہ بوحیرد کے نابینا ہونے پر کہی تھی۔ ملاحظہ ہو!

اگر تم نابینا ہوگئیں یا وہ روشنی ماند پڑ گئی جس نے میرے وطن میں شمعیں روشن کی تھی جنہوں نے مجھے اور میرے وطن کو استقامت عطا کی تھی۔ میری قوم کو عزت اور میری آنکھ کو ٹھنڈک بخشی تھی اگر تم نابینا ہوگئیں تو امید کا دامن نہ چھوڑو۔ میری آنکھوں کی روشنی حاضر ہے۔ (٦)

ثریا کی شاعری حب الوطنی اور احترامِ آدمی سے لبریز ہے۔ الفاظ و بیان میں شستگی و صفائی، لہجہ احتجاجی لیکن ٹھہراؤ اور برجستگی کے ساتھ چنیدہ بندش چھوٹی بحریں اور آسان الفاظ کا استعمال ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ غزل پہ نظم کو فوقیت دیتی ہیں اور مقصدیت پر نظر رہتی ہے یعنی ان کی شاعری میں صحافت کی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں اور مقالہ کا وصف بھی۔ سیاست اور شخصیت ان کی شاعری کا موضوع ہے۔ ان کے مقالوں میں بھی یہی عنوان پائے جاتے ہیں۔ اپنے ایک مقالہ میں سیاست کی بدترین حالت اور اس کی بالادستی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

''سیاست کا یہ عالمی اسٹیج ہے۔ سیاست فن ہے، مکر و فریب عیاری ہے اس فن کا خاص ترکیبیں پروپگنڈہ ہے۔ اس کے مکر و فریب میں سازش، فتنہ پردازی، منافقت دو رخاپن، موقع پرستی اور عیب جوئی ہے۔ اس کی دیوانگی کی علامت شیرون اور اسرائیل ہیں۔ امن کے لیے گفت و شنید اور جنگ بھی ہے۔ اس کا پر پیچ اور عیارانہ انداز کہاں نمایاں نہیں۔'' (٧)

ثریا قابل نے صرف شعر و شاعری میں طبع آزمائی کی بلکہ رفاہِ عام و فلاح عوام کے لیے پوری زندگی کوشاں بھی رہیں۔ انہوں نے مشہور شاعرہ سلطانہ سدیری کے ساتھ ملکر بڑا کام کیا۔ خواتین میں شعر و ادب

کا ذوق پیدا کرنے کے لیے "الجمعية الظهرية النسائية" جیسا رفاہی ادارہ قائم کیا اور امسیات الشعریہ یعنی عورتوں میں شعری نشستوں کو رواج دیا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شخصیت جامع الکمالات تھی۔ انہوں نے اپنے شعروں سے خوابیدہ ذہنوں کو جھنجھوڑنے کا کام کیا۔ حرکت و حرارت پیدا کرنا ہی ان کی شاعری کا مقصد تھا۔ ان کا قلم علم بن کر وجود کی جنگ میں انا کی سربلندی کی علامت بنا رہا ہے۔

رقیہ ناظر: شاعرات عرب میں رقیہ ناظر کا نام نمایاں ہے۔ ان کی شاعری احساسات و جذبات کی بہترین عکاسی کرتی ہے ان کے کلام عربی کے معیاری اخباروں اور رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا شمار ادباء، شعراء کی اس نسل میں ہوتا ہے جو خمسیات یعنی اس صدی کی پانچویں دہائی میں مطلع ادب پر ابھری ہے۔ ان کا مشہور قصیدہ ''سدت السبل'' جریدہ الندوہ کے عدد '۷۸۸۷' میں ۲۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ء کو شائع ہوا جو عورت کی نفسیات اور شوہر سے ذہنی و جسمانی قربت کی اہمیت و حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے اس کا مفہوم ملاحظہ ہو۔

''یہ چند اشعار ایک ایسی بیوہ کا شکوہ ہے جو اپنے شوہر اور گھر والوں کی زیادتی کا شکار ہے۔ شوہر کی زیادتی اپنی بیوی سے دوری ہے جو دوسری تمام اذیتوں سے بڑھ کر ہے۔ زمانے کے جور و ستم اس کے لیے قابل برداشت نہیں جن کو وہ زبان شکایت پر نہیں لاتی ہے۔ لیکن شوہر سے دوری کے سبب اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسوؤں کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ شوہر اس کی بڑھتی ہوئی عمر بیقراری اور غم ہجر کی کیفیات دیکھ کر حیرت بھی کرتا ہے اور یقین بھی دلاتا ہے کہ نادان نہ بن اور بے بنیاد مفروضوں کو اپنے دماغ میں جگہ نہ دے کیونکہ میرے خانۂ دل میں تو ہی تنہا مکیں ہے۔ یہ سن کر اس کی آنکھیں خوشی سے چھلک پڑتی ہیں اور وہ کہتی ہے اب میری راہیں آسان ہو گئی ہیں۔''

شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کے میدان میں بھی ان کی گراں قدر خدمات ہیں۔ انہوں نے اپنی فہم و

فراست کا ثبوت دیتے ہوئے معاشرے کے تئیں اپنی قربانی پیش کرنے کا جذبہ دکھایا اوران کا قلم تلوار کی طرح میدان کارزار میں حق کے لیے برسر پیکار ہے۔ سماج کی تمام برائیوں کو انہوں نے اپنی شاعری اور تصنیف کا موضوع بنایا۔ انہوں نے اپنے ایک مقالہ ''الحریۃ'' میں انسان کی انفرادی آزادی اور ان کی سماجی تحدید کا آفاقی اصول بیان کیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ!

''انسان کو آزادی سے متمتع ہونے کا موقع اور حق یقیناً دیا گیا ہے مگر ہمارا یہ حق وہاں سلب ہو جاتا ہے جہاں ہماری آزادی دوسروں کی آزادی کو نقصان پہنچانے لگے جب ہمارا تصرف آزادی دوسروں کے لیے باعث اذیت بن جائے تو ہمارے تصرف پر روک لگ جاتی ہے۔ چنانچہ آزادی کی کچھ حدود اور شرائط مقرر کردی گئی ہیں۔ جو لوگ اس کے برعکس سمجھتے ہیں وہ جہالت کا شکار ہیں اوران میں فہم وادراک کی کمی ہے۔'' (۸)

اس طرح رقیہ ناظر کی شاعری صرف سماجی خرابی یا بدعنوانی کو اجاگر ہی نہیں کرتی بلکہ ان کا حل بھی تلاش کرتی ہے جس سے ان کی فکری تحریک عملی تحریک میں تبدیل ہوتی ہے۔ ان کی شاعری کشش سے خالی اور مقصدیت سے پر ہے جو گدگداتی نہیں بلکہ رہنمائی کرتی ہے، ہنساتی نہیں بلکہ حقیقت سے آشنا کرتی ہے، سلاتی نہیں بلکہ بیدار کرتی ہے، آسمان کی خوشنما شکل پیش نہیں کرتی بلکہ زمین کے کھردری حقیقت سے متعارف کراتی ہے۔ فلسفہ ہی نہیں پیش کرتی بلکہ معصومیت اور حماقت کے فرق کو واضح کرتی ہے اور عمل صالح کی دعوت دیتی ہے۔

ڈاکٹر فاتنہ شاکر: جدید سعودی خواتین میں یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مشہور شاعرہ وادبیات کی صف سے تعلق رکھتی ہیں جن کو اکیڈمیات کے زمرے میں بلند مقام حاصل ہے۔ اکیڈمیات کی اصطلاح ان اہل علم وادب خواتین کے لیے استعمال ہوتی ہے جو ملک اور بیرون ملک میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد اکیڈمک زندگی سے وابستہ ہیں۔

ڈاکٹر فاتنہ شاکر ۱۹۴۰ء میں جدہ میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم وتربیت وہیں حاصل کی۔ اس کے

بعد انہوں نے جامعۃ القاہرہ کے کلیۃ التجاریۃ سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۶۲ء میں وہ امریکہ گئیں۔ جہاں سوشل اسٹڈیز میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی پھر اپنے وطن واپس آ کر وہ جدہ میں ''جامعہ ملک عبد العزیز'' میں درس و تدریس میں مشغول ہوگئیں۔ وہ شاعرہ کے ساتھ ساتھ ایک اچھی نثر نگار اور بہترین فنکار بھی تھیں۔ ان کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ جدہ ریڈیو سے پہلی نسوانی آواز جس خاتون کی فضاء میں بلند ہوئی وہ انہیں کی تھی ان کا مقبول ترین ریڈیو پروگرام ''البیت السعودی'' جدہ ریڈیو سے نشر ہوتا رہا۔ ان کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء میں ''الشرکۃ السعودیہ للابحاث والتشویش'' نے لندن سے عورتوں کا مشہور و مقبول میگزین ''سیدتی'' جاری کیا ڈاکٹر فاتنہ شاکر ہی اس کی پہلی مدعیہ ہوئیں۔ ان کے منتخب مقالات کا مجموعہ بنت الارض ۱۹۸۱ء میں جدہ سے شائع ہوا۔

فاتنہ شاکر کی شاعری میں نسائی درد کی بھرپور عکاسی ہے وہ چونکہ جدید تعلیم یافتہ خاتون تھیں اس لیے ان کے خیالات بھی روشن تھے انہیں عورت ہونے پر شرم نہیں بلکہ فخر تھا۔ وہ عربی عورتوں کے صبر و سکون اور عفت و پاکیزگی پر فخر کرتی ہیں۔ وہ اس سماج پر طنز ضرور کرتی ہیں۔ لیکن اس سے کنارہ کشی کے لئے بالکل مائل یا قائل نہیں۔ مغربی تعلیم اور کلچر سے واقفیت کے باوجود ان کی شاعری کے سر پر مشرقیت کا آنچل ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ آزادی کی خواہاں ہیں عریانیت کی نہیں اور یہی نسائی درس ان کی شاعری کا مرکز اور محور ہے۔

ڈاکٹر مریم بغدادی: جدید عربی شاعرات میں مریم کا نام مریم کی ہی طرح مقدس ہے۔ وہ نسائی ادب میں بلند رتبہ کی حامل ہیں۔ انہوں نے پیرس کی سوبورن یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ادب میں تخصّص کی ڈگری لی ان کی تالیفات اور مقالات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ شرکۃ تہامہ نے عواطف النسائیہ کے عنوان سے ان کا دیوان شائع کیا۔ ان کے اشعار وجدان و موسیقیت سے بھرے ہوئے ہیں۔ شعری صلاحیت قدم قدم پر دامن گیر ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کے فراق اور جدائی پر خونِ دل سے

جو اشعار قلم بند کیے ہیں ان میں امید، یاس، درد، حسرت، سعادت اور بدنصیبی کے جذبات کی ترجمانی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

سالت عليك يا املى وكان الشوق كا للهب

يحرق جل اركانى ولا اسكومن النصب

اس طرح ڈاکٹر مریم بغدادی جدید عربی شاعرات میں کئی اوصاف کی مالک ہیں۔ وہ جب تعریف کرتی ہیں تو تمام شاہی لوازمات ان کے قلم سے نکلنے لگتے ہیں۔ جب غزل کہتی ہیں تو بہار اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور پنکھڑی پنکھڑی محبوب کی پزیرائی میں محو رہتی ہے۔ لیکن جب ماتم یا گریہ کرتی ہیں تو تمام کائنات ماتم کدہ بن جاتی ہے۔ حرماں نصیبی، امید، یاس، درد، کسک، موت، کفن، تابوت، قبر، قیامت، مٹی اور فنا کے ساتھی سب کچھ ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یعنی ان کا قلم بہار میں رقص کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے اور موت پر ماتم کرنے پر قادر بھی ہے۔ زندگی کے نغمے بھی گاتا ہے اور موت کا راگ بھی الاپتا ہے۔ پھول بھی بنتا ہے خار بھی بنتا ہے۔ گویا ان کی شاعری ایک ایسا دسترخوان ہے جہاں تمام اشیاء حیات یکجا اور یکساں ہیں۔ جدید شاعرہ میں اتنی قدرت کسی ایک شاعرہ میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ وہ منفرد بھی ہیں اور ممتاز بھی۔

فارسی شاعرات

فارسی شاعری کی ابتداء حنظلہ بادغیسی سے ہوتی ہے۔ لیکن رودکی سمرقندی کو پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ فارسی شعراء کے تذکروں میں شاعرات غائب ہیں۔ جس طرح عربی کے ابن رشیق قیروانی نے اپنی کتاب العمدہ میں شاعرات کا تذکرہ نہیں کیا۔ بالکل اسی طرح محمد عوفی اور دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکروں ''لباب الباب'' اور ''تذکرۃ الشعراء'' میں بھی شاعرات کا ذکر نہیں کیا اور بعد کے محققین میں علامہ شبلی، براؤن اور رضازادہ شفق نے بھی انہیں نظرانداز کردیا۔ وہ ''شعرالعجم، ہسٹری آف پرسیا، اور تاریخ ادبیات ایران'' سے غائب ہیں۔ اس طرح فارسی ادب میں شاعرات موجود تو قدیم زمانے سے تھیں لیکن ان کے احوال وآثار اب باقی نہیں ہیں جس سے ان کا کارنامہ پسِ پردہ رہ گیا ہے۔

فارسی شاعرات میں سب سے مشہور معتبر اور مستند نام ایران کے نامور عالم ملّا محمد صالح قزوینی کی بیٹی قرۃ العین طاہرہ کا ہے جن کی علمی واقفیت بلند خیالی اور نکتہ دانی کا یہ عالم تھا کہ اقبال جیسا مشہور شاعر ان کے فلسفۂ زندگی اور شاعری کا صرف معترف ہی نہیں معتقد بھی ہے۔ اقبال نے اپنی مشہور تصنیف جاوید نامہ میں انہیں مشعلِ راہ اور موجد حرارت وحرکت قرار دیا ہے۔

علّامہ اقبال اپنے مرشد رومی کے ہمراہ جب فلک مشتری پر پہنچتے ہیں تو انہیں وہاں تین پاک باز روحیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے جسم پر لالہ گوں لباس ہیں اور ان کے چہرے سوز دروں سے تمتمارہے ہیں۔ رومی اقبال سے کہتے ہیں اگر تو نے شوق بے پروا کو نہیں دیکھا ہے تو ان کا نظارہ کر اور ان کی آتش نوائی سے زندگی حاصل کر۔ یہ تینوں روحیں غالب، منصور اور قرۃ العین طاہرہ کی تھیں جنہوں نے بہشت میں جانے سے انکار

کر دیا تھا اور بہشت پر گردشِ دوراں کو ترجیح دی تھی۔ طاہرہ کا عقیدہ تھا کہ جنوں کا گناہ نئی دنیاؤں کی تخلیق کرتا ہے۔ شوقِ بے حد پردوں کو چاک کر دیتا ہے اور لذت تازہ کاری سے طرز کہن کا خاتمہ ہوتا ہے۔ طاہرہ اقبال سے اپنے کلام کے ذریعہ مخاطب ہوتی ہے۔ سوز و مستی اور ذوق و شوق میں ڈوبی ہوئی ایک غزل سناتی ہے جس کے چند اشعار اسطرح ہیں۔

گر بتو افتد نظر چہرہ بہ چہرہ رو برو
شرح دھم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو
از پے دیدن رخت ہمچو صبا فتادہ ام
خانہ بخانہ در بدر کوچہ بکوچہ کو بکو
دردل خویش طاہرہ گشت وندید جز ترا
صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تو بہ تو (۹)

یہ سوز و گداز، شور مستی، قوت جبروت اور یقین محکم ان کی شاعری کا خمیرہ ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی بھی فنکارہ کے افکار میں طوفان برپا کر دیتی ہیں اور انسان طوفان کا رخ موڑ دیتا ہے۔ یہی وہ شور ہے جو اقبال کی پوری شاعری میں سنائی دیتا ہے اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو طاہرہ کو دیگر شاعرات سے بلند کرتی ہیں۔

یہ بھی ایک اتفاق ہی ہے کہ جہاں ہندوستان عربی شاعرات سے پوری طرح خالی ہے وہیں فارسی شاعرات سے پر۔ مغلیہ عہد میں ہمیں ایسی بہت سی شہزادیاں نظر آتی ہیں جو نہ صرف شعر کہنے پر قادر تھیں بلکہ صاحب دیوان بھی ہیں اور اس زمانے میں ہندوستان کو علمی و ادبی لحاظ سے ایران پر فوقیت حاصل ہے۔ ان شاعرات میں سب سے پہلا نام آتا ہے بابر کی بیٹی گل بدن کا جو صاحب کتاب بھی ہیں۔

گل بدن بیگم: مغل شہزادیوں کی علمی بزم میں سب سے پہلا نام گلبدن بیگم کا آتا ہے۔ یہ بابر کی بیٹی تھیں۔ شعروشاعری کا ذوق میراث میں ملا تھا۔ اعلیٰ تعلیم وتربیت کی بدولت ترکی اور فارسی زبان کی قابل قدر انشاپرداز اور شاعری ہوئیں۔ انکی تصنیف ہمایوں نامہ بہت ہی مشہور ہے۔ جس میں ہمایوں کے عہد کی تہذیبی، معاشرتی اور تاریخی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس کتاب کی انشاپردازی کے متعلق علاّمہ شبلی لکھتے ہیں۔

''فارسی زبان میں سادہ اور صاف واقعہ نگاری کا عمدہ سے عمدہ ترنمونہ تزک جہانگیری اور رقعات عالمگیری ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ ہمایوں نام کچھ ان سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے سادہ اور بے تکلف الفاظ روزمرہ کی عام بول چال طرزِ ادا کی بے ساختگی دل کو بے اختیار کر دیتی ہے۔''

ریاض الشعراء، مخزن الغرائب اور میر مہدی شیرازی کے تذکرہ ''تذکرۃ الخواتین'' میں ان کا نام شاعرات کی فہرست میں شامل ہے اوران کا یہ شعر مثال کے طور پر تینوں تذکروں میں پایا جاتا ہے۔

ہر پری روے کہ او با عاشق خود یار نیست
تو یقیں می داں کہ ہیچ از عمر برخوردار نیست

گلرخ بیگم: بابر کی یہ بھی بیٹی تھی اور صالح سلطان بیگم کے بطن سے تھی۔ یہ بھی شعروشاعری میں مہارت رکھتی تھی اور فارسی وترکی زبان میں شعر کہتی تھی لیکن بحیثیت شاعرہ مشہور نہ تھی۔ صبح گلشن کے مولف نواب علی حسن خان صاحب ان کی شاعری کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو!

''بہ گلرخی وشگفتہ روئی وسلیقہ شاعری سرآمد زمرۂ نسواں غنچۂ دبانش بہ نسیم اشعار لطیف می شگفت۔'' (۱۱)

تمام تذکرہ نگاران کے شاعرہ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں اوران کی خوبیوں میں چار چاند لگانے کی کوشش کررہے ہیں ''ریاض الشعراء، مخزن الغرائب اورصبح گلشن'' میں یہ شعر بھی انہیں کی طرف منسوب ہے۔

شعر ملاحظہ ہو۔

ہیچ گہ آں شوخ گل رخسارے بے اغیار نیست
راست بود است آنکہ در عالم گلِ بے خار نیست

سلیمہ سلطان بیگم: یہ بابر کی نواسی اور گلرخ بیگم کی بیٹی تھی۔ پہلے بیرم خان سے شادی ہوئی تھی، اس کے انتقال کے بعد اکبر کے حبالۂ عقد میں آئی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ سیاسی بصیرت بھی رکھتی تھی۔ جہانگیر اس کی قابلیت وصلاحیت کا معتقد تھا ان کے انتقال پر تزک جہانگیری صفحہ ۱۱۴ میں لکھتا ہے۔

''بہ جمیع صفات حسنہ آراستگی داشتند ، درزمان ایں مقدار ہنر وقابلیت کم جمع میں شود'' (۱۲)

آئین اکبری، اقبال نامۂ جہانگیری اور مآثر الامراء نے اس کا تخلص مخفی لکھا ہے لیکن مخزن الغرائب نے اس کا تخلص مخلص لکھا ہے اس یہ شعر سبھی تذکروں میں پایا جاتا ہے۔

کاکلت رامن زمستی رشتۂ جاں گفتم ام
مست بودم زیں مسبب حرفِ پریشاں گفتہ ام

جانان بیگم: بیرم خان کی لڑکی عبد الرحیم خانخاناں کی بہن اور اکبر کے لڑکے شاہزادہ دانیال کی بیوی تھی۔ بہت ہی حسین وجمیل عاقلہ تعلیم یافتہ اور دوراندیش خاتون تھیں۔ زیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہوئی اور کلام مجید کی تفسیر بھی لکھی۔ ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھی شاعرہ بھی تھی لیکن

اسلامی مشغولیات اور مذہبی مصروفیات نے اس فن کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا۔ ان کی علمی شخصیت نے شعری حسیّت کا گلا گھونٹ دیا۔ ان کا کلام ان کی شعری صلاحیت کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ چند شعر نمونہ کے لیے پیش خدمت ہے۔

خیز تا رہ برہ گزار کنیم
خویش را چشم انتظار کنیم
زراہ امن وسلامت کسی باد برسد
غبار تا نشود خاک پا باد نرسد (۱۳)

نور جہاں بیگم: نور جہاں صرف جہانگیر کی بیوی ہی نہیں حرم اور حکومت کے لیے باعث رونق و زینت بھی تھی۔ اس نے شاہی محل میں داخل ہوتے ہی اپنے شوق اور ذوق سے سارا مذاق ہی بدل دیا۔ تمام چیزوں میں جدت آ گئی۔ وہ چونکہ ایک علم پرور باپ کی بیٹی تھی اور ایک حکمراں کی ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ ادب اس کے خون میں سرایت کر گیا تھا۔ اس کی استعداد علمی اور سخن سنجی کا اعتراف ہر اہل علم و دانش کرتے ہیں۔ مرأۃ الخیال کے مؤلف کا بیان ہے۔

''در بذلہ سنجی وسخن گوئی وشعر فہمی وحاضر
جوابی از نسائے زمن ممتاز بود'' (۱۴)

ید بیضا اس طرح اس کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔

''درو ادی شعر بسیار خوش سلیقہ است'' (۱۵)

نور جہاں کی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی کی بہت سی مثالیں ہیں جس کی تصدیق منتخب اللباب اور مآثر الامراء سے بھی ہوتی ہے۔ چند دلچسپ مثالیں پیش کی جاتی ہیں جس سے اس کے شاعرہ ہونے کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔ ایک روز جہانگیر کپڑا بدل رہا تھا اس کا بٹن ''لعل بے بہا'' کا تھا نور جہاں نے اس کو دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا۔

''ترا نہ تکمہ لعل است بر قبائے جرید
شدہ است قطرہ خون منت گریباں گز''

ایک مرتبہ جہانگیر نے عید کا چاند دیکھ کر یہ مصرع پڑھا

''ہلال عید براوج فلک ہویدا شد''

نور جہاں نے فی البدیہہ دوسرا مصرع پڑھا

''کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد''

ایک مرتبہ جہانگیر اور نور جہاں کی ملاقات کئی دنوں کے بعد ہوئی۔ ملاقات کی خوشی میں نور جہاں کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ جہانگیر نے اس کیفیت کو دیکھ کر یہ مصرع پڑھا۔

''گوہر ز اشکِ چشم تو غلطیدہ می رود''

تو نور جہاں نے دوسرا مصرع فی البدیہہ کہا

''آبی کہ بے تو خوردہ ام از دیدہ می روم''

ماہ محرم ۱۰۲۸ھ میں آسمان میں ایک دم دار ستارہ نظر آیا نور جہاں نے اس کو دیکھ کر یہ شعر موزوں کیا۔

''ستارہ نیست بدیں طول سر بر آوردہ
فلک بشاطری شہ کمر بر آوردہ''

ملک الشعراء طالب آملی ایک بار شاہی عتاب میں گرفتار ہوا اس حالت میں نور جہاں کے پاس یہ شعر لکھ کر بھیجا۔

''ز شرم آب شدم آب را شکستی نیست

بحیرتم کہ مرا آبروئے از چہ شکست''

جب نور جہاں کو یہ شعر ملا تو اس نے فوراً یہ جواب لکھ کر بھیجا۔

''یخ بست و بشکست''

یہ تمام روایتیں مفتاح التواریخ کے صفحہ نمبر ۳۱۴ پر درج ہے اور مآثر الامراء کے مولف کا بیان ہے کہ نور جہاں کا تخلص مخفی تھا لیکن کسی اور تذکرہ نگار نے اس کی تصدیق نہیں کہ اور نہ ہی نور جہاں نے کسی شعر میں اس تخلص کا استعمال کیا ہے ''مرأۃ الخیال'' منتخب اللباب اور ماثر الامراء کے مؤلفین نے نور جہاں کے یہ اشعار اپنی کتابوں میں نقل کیے ہیں۔

دل بصورت نہ ہم نا شدہ سیرت معلوم

بندۂ عشقم و ہفتاد و دو دولت معلوم

زاہد ہول قیامت مکن در دلِ ما

ہول ہجراں گزرا ندیم قیامت معلوم

مفتاح التواریخ میں یہ شعر بھی نور جہاں کی طرف منسوب ہے۔

نور جہاں گرچہ بصورت زن است

در صف مرداں زنِ شیر افکن است

اور بقول مولف مفتاح التواریخ یہ دونوں رباعیاں بھی نور جہاں کی ہیں۔

گشا دغنچہ اگر از نسیم گلزار است

کلید قفل دل ماتبسمِ یار است

نہ گل شناس ونہ رنگ وبونہ عارض وزلف

دل کسی کہ بحسن دادا گرفتار است

اور دوسری رباعی اس طرح ہے۔

چو بردارم زرخ برقعہ زگل فریاد برخیزد

زنم برزلف اگر شانہ زسنبل داد برخیزد

بایں حسن وکمالاتی چودر گلشن گزرسازم

زجان بلبلاں شور مبارک باد برخیزد

نور جہاں نہ صرف شاعرہ تھی بلکہ شاعرات کی سرپرستی بھی کرتی تھی جسکی وجہ سے بہت سی شاعرہ اس وقت موجود تھیں جس میں سب سے مشہور نام مہری ہروی کا ہے جس کا ذکر بیشتر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔

جہاں آرا بیگم: شاہ جہاں اور ممتاز محل کی بیٹی تھیں۔ سیاسی حیثیت سے ان کا مقام بہت بلند تھا۔ ممتاز محل کی گود نور جہاں کی صحبت اور شاہجہانی عہد کی علمی وادبی فضاء میں رہ کر، علم وفضل کے لحاظ سے بھی ان کی شہرت کافی تھی۔ ابتدائی تعلیم ستی النساء خانم سے حاصل کی جو ملک الشعراء طالب آملی کی بہن تھیں۔ جہاں آراء کا تعلیم کا سفر تا حیات جاری رہا۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم پائی۔ جب وہ صرف ۲۶/سال کی تھیں تو انہوں نے مونس ارواح لکھی جس میں حضرت معین چشتی اور ان کے سلسلے کے بارے میں انتہائی عقیدت

کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ مصنف بھی تھی اور شاعرہ بھی، مونس ارواح میں ان کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔

نمونہ کے طور پر حمد کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

آنجا کہ کمال کبریائے تو بود عالم نمی از بحر عطائے تو بود

مارا چہ حد حمد و ثنائے تو بود ہم حمد و ثنائے تو سزائے تو بود

جہاں آراء بیگم تمام صنف شاعری میں طبع آزمائی کرتی تھیں۔ لیکن ان کی شاعری اور شخصیت میں زیادہ تر درد، حمد اور ثنا کے عناصر ہی پائے جاتے ہیں جس کی تصدیق مونس الارواح کے الفاظ اور اشعار سے بھی ہوتی ہے۔انہوں نے اپنے باپ کی وفات پر ایک مرثیہ بھی کہا تھا جس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

ای آفتاب من کہ شدی غائب از نظر

آیا شب فراق ترا ہم بود سحر

اے بادشاہ عالم و اے قبلۂ جہاں

یکشائے چشم رحمت و بر حال من نگر

نالم چنین ز غصہ و باد بود بدست

سوزم چو شمع در غم و دود م رود ز سر

ان کی قبر پر یہ شعر لکھا ہے۔

بغیر بندہ نہ پوشد کسی مزار مرا

کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیا بس اس

زیب النساء بیگم: اورنگزیب عالمگیر کی سب سے پہلی اولاد تھی جو کہ دلرس بانو کے بطن سے تھی۔ دستور تیموریہ کے مطابق اس کو سب سے پہلے قرآن پڑھایا گیا جس کے لیے ایک درباری کی ماں مریم کو بحیثیت معلّمہ مقرر کیا جو حافظ کلام پاک تھیں۔ زیب النساء نے بھی حفظ کیا۔ زیب النساء نے حفظ کے بعد عربی اور فارسی کی اعلی تعلیم حاصل کی۔ عالمگیر نامہ، ماثر عالمگیری اور مرۃ العالم اس کی تصدیق ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''واز تحصیل علوم عربی و فارسی بہیرۂ تمام اندوختۃ'' فقہ، اصول فقہ، علم حدیث اور شعر و شاعری کی تعلیم ملا محمد سعید اشرف مازندرانی سے حاصل کی۔ وہ شاعرہ بھی تھیں اور بہترین کلام موزوں کرتی تھیں۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام دیوان مخفی کے نام سے شائع ہو کر بازاروں میں مقبول ہے مگر ارباب نظر اسے زیب النساء کا دیوان نہیں مانتے کیونکہ اس کی تصدیق کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا ہے۔ مستند تذکرہ نگاروں میں احمد علی بھی مخزن الغرائب میں زیب النساء کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

''اما دیوان اشعارش جائے بنظر نیامدہ مگر در تذکرہ انتخابش بہ نظر آمدہ لیکن اعتبار را نشاید سبب آنکہ اکثر شعرا شاتذہ صاحب آں تذکرہ بنام بیگم نوشتہ بود۔''

علاّمہ شبلی نے بعض تذکروں کے اسناد پر صرف مندرجہ ذیل رباعی کو زیب النساء کی طرف منسوب کیا ہے۔

بشکند دستی کہ خم در گردنِ یاری نشد
کور بچشمی کہ لذت گیر دیداری نشد
صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقی جا گرفت
غنچۂ باغ دل ما زیب دستاری نشد

علاّمہ شبلی بھی ان کے معترف تھے۔ لکھتے ہیں!

''عالمگیر کی خشک مزاجی سے شاعری اور شعراء کو جو نقصان پہونچا تھا اس کی تلافی زیب النساء کے حسنِ مذاق سے ہوگئی۔'' (۱۷)

جدید فارسی شاعرات

پروین اعتصامی: جدید فارسی شاعرات میں پروین اعتصامی، فروغ فرخزاد، سیمین، بہبہانی، لیلا کسریٰ اور پروین صبا کا نام انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن پروین اعتصامی کا نام جدید شاعرات میں سب سے پہلے آتا ہے۔ وہ ۱۹۰۶ء میں تبریز میں پیدا ہوئی۔ بچپن تہران میں گزرا اور ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کیا اس کے بعد امریکن گرل اسکول میں داخل ہوئی اور ۱۹۲۵ء میں چچازاد بھائی کے ساتھ شادی ہوئی اور ڈھائی ماہ بعد ہی طلاق ہوگیا۔ ۱۹۳۷ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا۔ ۱۹۳۹ء میں ان کے والد کا انتقال ہوا اور ۱۹۴۲ء میں وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ اپنے خاندانی قبرستان ''صحن جدید'' میں والد کے پہلو میں دفن ہوئیں۔ ان کے سنگ مزار پر انہی کی ایک نظم جو اس دن کے لیے کہی گئی تھی کندہ کردی گئی جس کا ایک شعر درج ذیل ہے۔

این کہ خاک سیہش بالین است

اختر چرخ ادب پروین است

پروین بچپن ہی سے شعر کہتی تھیں اور اپنے والد اعتصام الملک سے اصلاح کرواتی تھیں۔ ان کے کلام میں روانی فصاحت اور سلاست کے ساتھ ساتھ بلند حکیمانہ مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری اصلاحی فلاحی اور سماجی شاعری ہے اسی وجہ سے ان کا شمار ایران کے بلند پایہ شاعروں کی صف میں ہوتا ہے۔ پروین کی شخصیت اور شاعری کے متعلق ملک الشعراء محمد تقی بہار لکھتے ہیں!

''پروین نے شاعری کے تمام قیود و شرائط کی پابندی کا خیال رکھا۔ اس شیریں سخن خاتون شاعر کی اگر صرف سفر اشک ہی باقی رہ جاتی تو بھی شعر و ادب کے دربار میں اس میں اس کی بلند مقامی کی سند کے لئے کافی تھی جبکہ لطف حق، کعبہ دل، گوہر اشک، روح آزاد، دریائے نور، گوہر و سنگ، حدیث مہر، ذرہ چوپائی خدا، نغمہ صبح اور دیگر قطعات ایسے ہیں جس میں سے ہر ایک بجائے خود ان کی شاعرانہ لیاقت کی دلیل ہے۔''

ان کی شاعری کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے۔ دیوانہ اور زنجیر میں کہتی ہیں!

گفت با زنجیر در زندان شبی دیوانہ ای

عاقلاں پیداست کر دیوانگاں ترسیدہ اند

اشک یتیم کے عنوان کی نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو!

روزی گزشت یادشہی از گزرگہی

فریاد شوق بر سرِ ہر کوی و بام خاست

مست و ہشیار میں اس طرح طنز کرتی ہیں!

محتسب مستی بره دید و گریبانش گرفت

مست گفت ای دوست ایں پیراہن است افسار نیست

شکایت پیرزن میں اس طرح شکایت کرتی ہیں!

سنگینی خراج بما عرصہ تنگ کرد

گندم تر است حاصل ما غیر کاہ نیست

پروین اعتصامی جدید فارسی شاعری کا ایک منور اور مستند نام ہے۔

جس کے نقوش کو ابر و باد مٹانے سے قاصر ہیں۔

فروغ فرخزاد: فروغ فرخزاد کی شاعری نسائی احتجاج کی پہلی آواز ہے۔ انہیں سب سے کم عمراور سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں تہران میں پیدا ہوئی۔ کم سنی میں ہی شادی ہوگئی اور ایک لڑکے کی ماں بھی بن گئی، طلاق بھی ہوا۔ ۱۹۶۸ء میں ایک کارخانے میں جان بحق ہوگئی۔ وہ شریف سلیقہ منداور مہربان شاعرہ تھی اس کی روح میں نسائی تڑپ پائی جاتی تھی جس کے لئے اس نے ہر قسم کی روایتی بیڑیوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ یہی دلیری، جسارت اور بے باکی اسکی شاعری کی شناخت ہے۔

فروغ کا پہلا مجموعہ کلام اسیر ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد دیگر مجموعے ''دیوار'' اور عصیان شائع ہوا ان تینوں مجموعوں میں نسائی بے بسی، تڑپ اور درد کا غلبہ ہے اور وہ اس نسائی قید خانہ کے تمام اصول وضوابط کی دیواروں کو اپنے پیروں تلے روند دینا چاہتی ہے اور اس کا غصہ کبھی انکار تو کبھی عریانیت کی شکل میں سماج کو چڑھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس سے علماء دین ہی نہیں علماء ادب بھی بدظن نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی شاعری میں ان کے یا نسائی جذبات واحساسات کو سمجھنے کے بجائے صرف انکار اور عریانیت کی تلاش شروع ہوگئی تاکہ اس مشہور شاعرہ کو معتوب شاعرہ قرار دیا جائے۔

اپنے چوتھے مجموعہ ''تولدی دیگر'' میں وہ نئی زندگی کا آغاز کرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ اس کی شخصیت افکار دونوں کا پنرجنم ہے۔ جس میں اس کی ضدی شخصیت قدرے سنجیدہ نظر آرہی ہے اور اس کی شاعری کا دائرہ وسیع تر ہوا ہے۔ جس میں وہ عورت محبت اور نفرت سے اوپر اٹھکر زندگی کے بارے میں سنجیدہ غور وخوض کرتی ہے اور ایک لائحۂ عمل کے طور پر زندگی بسر کرنے پر مائل نظر آتی ہے۔ لیکن جیسے ہی اس کے اندر تبدیلی آئی وہ دنیا کو چھوڑ گئی۔ انتقال کے بعد اس کا پانچواں مجموعہ کلام ''ایمان بیاوریم بآغاز فصل سرد'' شائع ہو۔ اجس میں تخریبی پہلو

پر تعمیری پہلو غالب نظر آتا ہے۔ چند اشعارِ فروغ حسب ذیل ہیں۔ آفتاب می شود کے عنوان سے لکھتی ہیں۔

نگاہ کن کہ غم دروں دیدہ ام
چگونہ قطرہ قطرہ آب می شود
چگونہ سایہ سیاہ سرکشم
اسیر دست آفتاب می شود

جذبات کا اظہار اسطرح کرتی ہیں!

امشب درون سینۂ من موج تو فانہاست
سیلاب خون در بستر رگہای من جاری است
امشت دریں صحرائی بی فریاد روح من
چو عصمت آئینہ ہا تنہائے ست

نسائی بے بسی اور بے یقینی کا ماتم اس انداز میں کرتی ہیں۔

من پشیمان نیستم
من بایں تسلیم می اندیشم ایں تسلیم دردآلود
برفراز تپہ ہای قتلگاہ خویش بوسیدم

پروین تکین : پروین تکین کا نام بھی فارسی کی جدید شاعرات میں اہم ہے۔ وہ ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئی۔ والد بامداد حسین صبا جو روزنامہ ستارۂ ایران کے ایڈیٹر تھے ۱۹۲۲ء میں ہی انتقال کر گئے۔ اس طرح وہ

ایک ہی سال میں یتیم ہوگئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے ہی شہر میں حاصل کی پھر کالج میں داخل ہوئی اور فارسی ادبیات میں گریجویشن کیا۔ وہ جدید شاعری اور قدیم شاعری میں فرق نہیں کرتی۔ بالکل دونوں کی یکساں معتقد و معترف ہے۔ آواز رہگزر اس کی وہ تخلیق ہے جس سے وہ مشہور ہوئی جبکہ اس کی دوسری تخلیقات کو وہ پزیرائی نہیں ملی۔ آوازہ رہگزر کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

گوئی اے رہگزر راز داغ ولم بی خبری

کہ بہر نالہ ات از سینہ بر آید شرری

مگر ایں آتش من از بر دیوار گزشت

کہ در افتادہ بہ دامان دل رہگزری

سیمین بہبہانی: ان کا نام آتا تو جدید شاعرہ میں ہے لیکن یہ پرستار ہیں قدیم شاعری کی۔ ۱۹۲۸ء میں تہران میں پیدا ہوئیں۔ والد عباس خلیلی روزنامہ اقدام کے ایڈیٹر بھی تھے اور مشہور ادیب بھی۔ والدہ فخر عادل خلعتبری بھی شاعرہ تھیں۔ سیمیں نے قانون کی پڑھائی کی مگر پوری زندگی طالب علم اور معلّمہ رہیں۔ انہوں نے تہران کے مختلف ہائی سکنڈری اسکولوں میں بحیثیت معلّمہ اپنی خدمات انجام دیں۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۵۲ء میں ''جای پا'' کے نام سے شائع ہوا اس کے بعد دوسرے مجموعے چلچراغ، مرمر اور رستاخیز یکے بعد دیگرے منظر عام پر آئے سمیں اپنی شاعری کے بارے میں خود کہتی ہیں۔

''میں خاص طور سے کلاسیکی شاعر ہوں لیکن اس کے ساتھ کبھی اس تنگ نظری کی قائل نہیں رہی کہ دو مصرعوں کی مساویانہ درازی کی رعایت رکھنی ہمیشہ ضروری ہے یا وزن و قافیے کا استعمال ایک ناقابل اجتناب امر ہے۔'' (۱۹)

جذبات واحساسات کی آزادی اور عریانیت کے متعلق لکھتی ہیں۔

''میرے خیال میں شعر کا یہ لازمی عنصر نہیں ہے کہ شاعر کچھ کہے وہ اخلاقی اصول سے ہم آہنگ بھی ہو۔ شعر درحقیقت انسان کے انتہائی اندرونی اور عمیق احساسات کی تراوش کا نام ہے۔ اگر لاابالی پن سے بھی اس کا اظہار ہو تو بھی اس میں حسن زیبائی ہوتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس میں کسی کی تقلید اور پیروی کی جھلک نہ ہو۔ ہر شاعر کو اپنی فکری اصالت کی نگہداشت کرنا بہتر ہے۔'' (۲۰)

ان کے کلام میں امید کہ روشنی مایوسی کی ظلمت پر غالب نظر آتی ہے۔شاید کہ مسیحاست کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

زہدان افق باروراز نطفۂ نوراست

خورشید جگر گوشہ این ظلمت کوراست

بگزار کہ بر وسعت این بام کشد تن

آں صبح کہ از باور چشماں تو دوراست

اردو شاعرات

اردو شاعرات میں سب سے پہلا نام بیگم کا آتا ہے جو میر تقی میر کی لڑکی تھیں ان کا شعر معیاری اور اعتباری معلوم ہوتا ہے۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

بر سو غم گیسو میں گرفتار تو رکھا

اب کہتے ہو کیا تم نے ہمیں مار تو رکھا

کچھ بے ادبی اور شب وصل نہیں کی

ہاں یار کے رخسار پہ رخسار تو رکھا

اتنا بھی غنیمت ہے تیری طرف سے ظالم

کھڑکی نہ رکھی روزن دیوار تو رکھا

یہ اشعار ''تذکرۂ شمیم سخن، بہارستان ناز، اور تذکرۂ خواتین'' میں درج ہیں۔ ایک نام کاملہ بیگم جعفری کا بھی آتا ہے۔ وہ جعفری تخلص سے شعر کہتی تھیں۔ فصیح الدین رنج اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

''یہ عورت نہایت نیک بخت پاکیزہ سرشت صاحب عصمت وحیا، موزوں طبع تھی۔ زبان اردو میں گاہ گاہ مشق سخن کیا کرتی تھی۔ (۲۱)

کہا منصور نے سولی پہ چڑھ کر عشق بازوں سے

یہ اس کے بام کا زینہ ہے آئے جس کا جی چاہے

تصور اس صنم کا دل میں لائے جس کا جی چاہے

ہماری بات سن کر آزمائے جس کا جی چاہے

اس زمانے کی شاعرات میں ایک نام جمعیت نامی شاعرہ کا بھی آتا ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی دسترس رکھتی تھی۔ علم موسیقی سے بھی دلچسپی تھی اور مذہب عیسائیت تھا۔ ان کے کلام میں پاکیزہ اوراخلاقی عنصر غالب ہے۔

مقسوم کی خوبی ہے یہ قسمت کا ہے احسان

رہتا ہے خفا مجھ سے جو دلبر کئی دن سے

مشہور شاعر نواب مرزا محمد تقی خاں ہوس کی صاحبزادی ''پارسا'' کا شمار بھی شاعرہ میں ہوتا ہے لیکن اس کے چند اشعار ہی تذکروں سے دستیاب ہوسکے ہیں جس میں یہ شعر بہت ہی مشہور ہے۔

تن صورت حباب بنا اور بگڑ گیا

یہ قصر لا جواب بنا اور بگڑ گیا

اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ دکن کی ایک مشہور طوائف تھی جو حیدر آباد میں قیام پزیر تھی اور اس کا نام ماہِ لقا تھا۔ تمام تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ شاعرات میں پہلی مرتبہ ماہ لقانے ہی اپنا دیوان ترتیب دیا جس کی تصدیق میں سبھی تذکرہ نگار صف آراء ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباسات اس کی گواہی دیتے ہیں۔

''جیسے ریختہ گویوں میں فرقہ زکور میں ولی کوسب سے پہلے ترتیب دیوان کا شرف حاصل ہے اسی طرح طبقۂ اناث میں ریختہ کی سب سے پہلی صاحب دیوان یہی گزری ہیں۔ جملہ اصناف پر قادر ہیں۔'' (۲۲)

مولف تذکرہ نسوانِ ہند لکھتا ہے!

''جس طرح اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ولی دکنی مانا جاتا تھا اسی طرح اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ چندا ماہ لقا تسلیم کی جاتی ہے۔'' (۲۳)

چندا ماہ لقا کے علاوہ بیگم دفتر حجاب،، دختر نواب اعظم نواب شاہ جہاں، بیگم شیریں، نجم النساء بھی مشہور

شاعرہ تھیں۔ لیکن ان کا شعری کارنامہ تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو گیا۔ تذکروں میں جن شاعرات کا ذکر ملتا ہے ان میں غالب حصہ شاہدانِ بازاری کا ہے کیوں کہ شریف عورتیں شاعری کو معیوب سمجھتی تھیں اس خیال سے کہ شاعری فحش گوئی کا زینہ ہے۔

اس کے متعلق مؤلف تذکرۂ شمیم سخن لکھتا ہے۔

''جب ہم یہ تذکرہ لکھتے تھے تو باوجود کوشش بسیار کے بہت کم عورتیں باعفت وعصمت وذی علم شاعرہ نظر آئیں اور اکثر عورت بازاری کو شاعر پایا۔''(۲۴)

شاعرات نے آہستہ آہستہ ترقی کی منزلیں طے کیں۔ حب الوطنی کے گیت بھی لکھے اور ترقی پسندی کے نعرے بھی ان شاعرات میں سعیدہ بیگم رقیہ بانو، زہرہ صفیہ شمیم، زیب تاجور، زاہدہ خلیق، نجمہ تصدق، آمنہ، برجیس، کنیز میمونہ اور نازش کا نام قابل ذکر ہے۔ آمنہ برجیس کہتی ہیں۔

یہ کس کی خدائی ضربت پا سے ہوئی بیدار
سرمایہ وافلاس میں ہیں جنگ کے آثار

رفیعہ بانو کا تیور ملاحظہ ہو!

بدل دونگی نظام زندگی کو سعی پیہم سے
زمانہ کانپ اٹھے گا میرے عزم مصمم سے
میرے بگڑے ہوئے تیور سے طوفاں دم بخود ہونگے
میرے بپھرے ہوئے نعروں سے انساں دم بخود ہونگے

آہستہ آہستہ شاعرات کی شعری روش میں جنسی موضوعات نے بھی جگہ پالی اور زمانے کے ساتھ ساتھ اس میں شدت بھی آتی گئی۔ آزادی کے بعد اس میں مزید جسارت اور بے باکی پیدا ہوئی۔ زاہدہ زیدی،

ساجدہ زیدی، فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کے یہاں جنسی جسارت اور بے باکی نقطۂ عروج پر ہے۔ فہمیدہ ریاض کا یہ انداز الگ پیغام دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

یہ کیسی لذت ہے جسم شل ہو رہا ہے میرا

یہ کیسا مزا ہے کہ جس سے عضو عضو بوجھل

یہ کیفیت کیا کہ سانس رک رک کے آرہا ہے

یہ میری آنکھوں میں کیسے شہوت بھرے اندھیرے اتر رہے ہیں

یہ آبنوس بدن پر بازو کشادہ سینہ

میرے لہو میں سمٹتا سیّال ایک نکتے پر آ گیا ہے

میری سانسیں آنے والے لمحے کے دھیان سے کھینچ کے رہ گئی ہیں

بس اب تو سر کا دو رخ پر چادر

دیے بجھا دو

یہی بات کشور ناہید اس اچھوتے انداز میں کہہ گزرتی ہیں۔

مجھے پانی کے جوہڑوں میں نہاتی

وہ عورتیں اور بطخیں اچھی لگتی ہیں

جنہیں کسی حرف ناآشنا نے

پاکیزہ نہیں کیا۔

ملک عزیز کے تقسیم کے بعد ہندوستان کی بنسبت پاکستان میں اچھی شاعرہ کی تعداد زیادہ ہے جب کہ ان تمام شاعرات کے آباء واجداد کی سرزمین ہندوستان ہی رہی اور ان کی شاعری میں یہاں کی خوشبو آج بھی پائی

جاتی ہے۔ خواہ وہ زہرا نگاہ ہوں، ادا جعفری ہوں، فہمیدہ ریاض ہوں یا کشور ناہید ہوں، یاسمین حمید یا ممتاز مرزا ہوں یا پروین شاکر ہوں۔ ان تمام شاعرات نے غزل پہ نظم کو فوقیت دی۔ جہاں سسکتی آہ کم اور احتجاجی لہجہ زیادہ ہے۔ بے باکی اور جسارت بھی ہے۔ بندش کی دیوار گرادینے کا جذبہ بھی ہے اور بڑھکر حق چھین لینے کی ہمت بھی ہے۔ یہ تعلیم سے آراستہ بھی ہیں اور الفاظ سے مسلح بھی۔ انداز بغاوت ملاحظہ ہو۔

در اگر بند ہوں دیوار گرا دے گا یہ

دل کا سیلاب کناروں سے نکلنا چاہے

ان مشہور شاعرات پر آخری باب میں تفصیل سے بحث ہوگی۔

باب دوم

پروین شاکر کے احوال و آثار

خوشبوؤں کی سفیر تلخی وتمناؤں کی شاعرہ پروین شاکر کا جنم ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی میں ہوا۔ ان کو گھر والے پیار سے پارہ کہتے تھے۔ والد کا نام سید شاکر حسین اور والدہ کا نام افضل النساء بیگم عرف منّن تھا۔ سید شاکر حسین ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ ثاقب تخلص کرتے تھے ان کا آبائی وطن صوبہ بہار ہندوستان تھا۔ ان کی جائے پیدائش اور جائے رہائش میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ قاضی مشتاق احمد اپنی کتاب ''اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک'' میں لکھتے ہیں کہ!

پروین شاکر کا آبائی وطن چندن پٹی تحصیل لہریا سرائے ضلع دربھنگہ ہے۔ ان کے والد سید ثاقب حسین شاکر بھی شاعر تھے''۔ (۲۵)

قاضی مشتاق احمد کی اس تحریر سے نہ صرف پروین شاکر کا آبائی وطن بلکہ والد کے نام پر بھی اختلاف پایا جاتا ہے کیونکہ بیشتر محققین نے ان کے والد کا نام سید شاکر حسین اور تخلص ثاقب لکھا ہے جب کہ قاضی صاحب والد کا نام سید ثاقب اور تخلص شاکر لکھتے ہیں۔

پروین شاکر کے والد کا نام اور آبائی وطن کے بارے میں ڈاکٹر روبینہ شبنم اپنی تصنیف ''اردو غزل کی ماہ تمام پروین شاکر'' میں رقمطراز ہیں۔

''والد کا نام سیّد شاکر حسین اور تخلص ثاقب تھا وہ صوبہ بہار کے ضلع گیا کے شیخو پورہ گاؤں کے رہنے والے تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر کہتے تھے۔'' (۲۶)

جبکہ ایک اور تحقیقی مقالہ کچھ اور کہہ رہا ہے۔ صبیحہ شکیل کا ایک مقالہ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر قاضی عبدالرحمان ہاشمی کے زیر نگرانی انجام پایا ہے اس میں مقالہ نگار صبیحہ شکیل صاحبہ نے پروین شاکر کا

آبائی وطن حسین آباد ضلع مونگیر بہار لکھا ہے اور یہی درست ہے جس کی تائید پروین شاکر کے عزیز ڈاکٹر ناظم جعفری نے رسالہ آجکل ستمبر ۱۹۶۹ء میں کی ہے۔ جب میں نے پروین شاکر کے ان رشتہ داروں سے رابطہ کیا جو بہار میں مقیم ہیں تو ان لوگوں نے بھی ان تمام مقاموں کو ان کا گھر، چھاونی، چچا اور چچازاد بھائیوں کی رہائش بتایا جو ان تینوں جگہوں پر مقیم ہیں جن کا ذکر ہوا ہے۔ سید شاکر حسین ثاقب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی اور اعلیٰ تعلیم پٹنہ میں ہوئی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۴۶ء میں پاکستان چلے گئے اور T.N.T. میں سرکاری عہدہ پر فائز رہے۔

سید شاکر حسین اپنے سات بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ سید منظورالحسین، سید جابر حسین، ناظر حسین، ناصر حسین، بابر حسین، نادر حسین، بڑے بھائی تھے۔ جن میں منظورالحسین کے علاوہ سبھی بھائی جوانی میں ہی انتقال کر گئے۔ پروین شاکر کا تعلق پٹنہ کے محلّہ افضل پورے سے تھا اور ان کے نانا کا نام کاظم حسین تھا۔ پروین شاکر کی دو خالہ بھی تھیں جن کی شادیاں موضع کلھوا ضلع مظفر پور، میں ہوئی تھی۔ سیّد شاکر حسین ۱۹۸۴ء میں ریٹائر ہوئے اور فروری ۱۹۹۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ نسرین شاکر، پروین شاکر۔ نسرین شاکر ہومیو پیتھ کی ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں، کراچی میں ان کا دواخانہ ہے۔ اولاد سے محروم ہیں ان کا طلاق ہو گیا تھا اور طلاق کے بعد سے وہ مستقل طور پر اپنی والدہ کے ہمراہ رہتی ہیں۔

پروین شاکر بچپن سے ہی حسین، حساس اور ذہین وفطین تھیں ان کی ابتدائی تعلیم زاہدہ تقی کے اسکول رضویہ گرلز سکنڈری اسکول سے ہوئی جہاں سے انہوں نے ۱۹۶۶ء میں میکٹرک پاس کیا۔ سرسید گرلز کالج سے انٹر کیا، ۱۹۶۸ء میں بی۔اے آنرز کیا ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۳ء میں انگریزی سے یم۔اے کیا اور اسی سال عبداللہ گرلز کالج میں بطور انگریزی لکچرر ان کی تقرری ہوئی اس کے بعد پھر انہوں نے لسانیات میں ایم۔اے۔کیا۔ پروین شاکر کے تعلیمی مراحل کے متعلق سحر النصاری صاحب رقمطراز ہیں۔

''اس شجر پر بہار کو میں نے اس وقت سے دیکھا، جانا اور پہچانا ہے جب وہ ایک نخل نوخیز کے مانند کسی تخلیقی جہت میں نمو پانے کی خواہش سے معمور تھا پروین شاکر اس وقت نویں جماعت کی طالبہ تھیں اور ہمارے عہد کے ایک قابل قدر خاتون زاہدہ تقی کے اسکول رضویہ گرلز کالج میں پڑھتی تھیں اور اسی شہر میں مرحلہ وار اپنی تعلیم اور تخلیقی صلاحیت کے جوہر دکھاتی رہیں۔ انگریزی میں آنرز کیا پھر انہوں نے انگریزی ادبیات میں یم.اے کیا۔ کالج میں لکچرر ہو گئیں پھر لسانیاں میں یم.اے کیا اور کچھ دن کے بعد سول سروس میں منتخب ہو گئیں۔''(۲۷)

پروین شاکر کی ذہانت وفطانت، اہلیت وصلاحیت کا تذکرہ ہر ایک کے زبان پر ہے۔ ان کی تعلیم وتربیت وشخصیت کے متعلق ڈاکٹر روبینہ شبنم لکھتی ہیں۔

''پروین کا شمار بچپن سے ہی ذہین وفطین طالبہ میں ہوتا تھا۔ وہ اپنی ہر کلاس میں بہترین پوزیشن حاصل کرتی تھیں۔ پروین نے میٹرک کا امتحان رضویہ گرلز ہائی اسکول کراچی سے پاس کیا۔ ۱۹۷۱ء میں سرسید گرلز کالج سے انگلش لٹریچر کے ساتھ بی.اے. آنرز کیا۔ ۱۹۷۲ء میں جامعہ کراچی میں داخل ہوئیں اور یہاں سے ایم.اے. انگلش کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ سیکنڈ ایم.اے. کی ڈگری لسانیات میں جامعہ کراچی سے حاصل کی۔ ۱۹۹۲ء میں ماسٹرز ان بینک ایڈمنسٹریشن کی ڈگری ہارڈ ورڈ یونیورسٹی سے حاصل کی پھر اسی سال مینجمنٹ انفارمیشن کا کورس کیا۔ رول آف میڈیا ان ۱۹۷۱ء وار پر پی.ایچ.ڈی کا تھیسس لکھنا چاہ رہی تھیں۔''(۲۸)

پروین شاکر جس قدر ذہین تھیں درس وتدریس کے شعبہ میں اس قدر کامیاب نہیں ہوئیں کیونکہ درس وتدریس کا یہ سلسلہ ان کے لیے نیا تھا اور اسٹوڈنٹس بے صلاحیت کیونکہ جن طلبہ سے ان کا واسطہ پڑا ان میں بیشتر ایسے تھے جنہوں نے چھٹی جماعت کے بعد سے انگریزی پڑھی تھی۔ جبکہ پروین شاکر کی زبان بالکل انگریزوں

جیسی تھی اس لیے افہام وترسیل کا مسئلہ پیچیدہ رخ اختیار کرتا گیا اور ان کی صلاحیت بروئے کار نہیں آپا رہی تھی۔ اسی لیے وہ مطمئن نہیں ہو پا رہی تھی اور انہوں ملازمت تبدیل کرنی چاہی۔ انہوں نے اس کے لیے سول سروس کا رخ کیا اور مقابلہ کی تیاری میں جٹ گئیں۔ عبداللہ کالج میں انہوں نے نو سال اپنی خدمات انجام دیں۔

پروین شاکر کی ذہانت وحساسیت کے مدِّ نظر والدین کو ایک اچھے رشتہ کی تلاش تھی۔ نسرین شاکر کے طلاق کی وجہ سے والدین کے دل میں منفی رجحان گھر کر گیا تھا جس کی وجہ سے تلاش وجستجو میں مزید دقت آ رہی تھی۔ نئے ملک میں حسب ونسب ذات پات اور مذہب ومسلک کا بھی مسئلہ تھا بالاخر ان کی شادی ان کے خالہ زاد بھائی نصیر علی سے طے پائی، ان کی ملازمت پاکستان آرمی میڈیکل کور میں تھی۔ شادی دونوں کی رضامندی سے ۱۹۷۶ء میں ہوئی اور ابتدائی دنوں میں یہ جوڑا انتہائی خوش وخرم تھا۔ پروین شاکر کی طرح ہی ڈاکٹر نصیر علی بھی خوش شکل اور بظاہر تمام خوبیوں کے مالک تھے۔ لیکن خوشبو اور بارود کی بو زیادہ دنوں تک ایک ساتھ نہیں رہ سکتی آخر وہی ہوا جس کا خطرہ شروع سے ہی والدین کو لاحق تھا۔ روایتی سوچ اور غلط الزامات اور عہدہ کی مصروفیات نے ان روحوں کے مقدس رشتے کو طلاق میں بدل دیا۔ نصیر علی سے ایک لڑکا بھی ہوا۔ جس کا نام مراد ہے وہ مستقل پروین شاکر کے ساتھ رہتا رہا۔ پروین شاکر ۱۹۷۹ء میں ماں بنیں اور ۱۹۸۷ء میں نصیر علی سے علیحدگی اختیار کی۔ طلاق کے حادثے نے پروین شاکر کے دل ودماغ پر گہرے اثرات مرتب کیے جو ان کی شخصیت میں عنصر بن کر ان کی تمام تخلیقات میں دیکھائی دیتا رہا جب کوئی ان سے ان کی زندگی کے نشیب وفراز پر بات کرتا ہے اور ان سے دریافت کرتا ہے کہ زندگی کا سب سے برا لمحہ اور سب سے برا دھچکا کون ہے تو وہ نہایت حسرت کے ساتھ جواب دیتی ہیں۔ I am a single parent جس سوسائٹی میں ہم رہتے ہیں وہاں یہ بہت ہی مشکل کام ہے It is hard life to live. میں کوشش کرتی ہوں کہ اسے خوشگوار بنا سکوں۔‘‘ (۲۹)

اس حادثے نے پروین شاکر کو بالکل بے بس کر دیا اور انہوں نے ایک بار پھر سماجی دنیا سے کتابی دنیا کا رخ کیا اور اپنی تیاری میں مصروف ہوگئیں اور کامیاب بھی ہوئیں۔ انہوں نے ۱۹۸۱ء میں سی. ایس. ایس. اور اکتوبر ۱۹۸۲ء میں پاکستان سول سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۸۳ء میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آپ کسٹم اینڈ ایکسائز سروسز کراچی میں ٹریننگ حاصل کی۔ ۱۹۸۴ء میں ان کی پوسٹنگ اسسٹنٹ کمشنر کسٹم ہاؤس کراچی میں ہوئی۔ اسی دوران پروین شاکر نے کسٹم اینٹلی جنس کورس پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مکمل کیا۔ ۱۹۸۶ء میں ان کا تبادلہ اسسٹنٹ کمشنر کسٹم ہاؤس کراچی سے سیکنڈ سکریٹری کے عہدے پر سنٹرل بورڈ آف ریونیو اسلام آباد میں ہوگیا۔ ۱۹۸۸ء میں ان کو راولپنڈی میں اسسٹنٹ کلکٹر اینڈ سیلز ٹکس کا عہدہ ملا۔ اس کے بعد ڈپٹی ڈائرکٹر ہو کر اسلام آباد میں آگئیں۔ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۳ء ان کا قیام امریکہ میں رہا۔ ۱۹۹۵ء میں انہیں ہارورڈ یونیورسٹی سے اسکالرشپ ملی۔ ۱۹۹۳ء میں وہ پھر پاکستان واپس آئیں اور انہوں نے اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں۔

ان تمام مصروفیات کے ساتھ ساتھ پروین شاکر ایک اچھی کالم نگار اور بہترین شاعرہ بھی تھیں۔ بچپن میں انہوں نے اپنا تخلص بینا رکھا لیکن بعد کی تمام شاعری میں پروین ہی استعمال کیا۔ شاعری پروین شاکر کے خون میں داخل تھی ایک اثنیٰ عشریٰ گھرانے میں آنکھ کھولنے والی بچی ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی شعر کی آہنگ کو جز وسماعت کر چکی تھی۔ میر انیس کے اشعار غیر شعوری طور پر اس کی لفظیات کے حصہ بن چکے تھے۔ زبان وتہذیب کا وہ آہنگ جو ہمیں اکثر شعوری طور پر کرنی پڑتی پروین شاکر نے ورثے کے طور پر پائی پروین شاکر کی پرنم شخصیت جاذب کیفیت تہذیب وتمدن اور شعرا آہنگ کے متعلق ممتاز مفتی یوں لب کشا ہیں۔

''وہ بہارن ہے، بہاتیں جسمانی طور پر دھان پان ہوتی ہیں لیکن اتنی تیکھی کہ سوئی کی طرح چبھ جاتی ہیں کٹر شیعہ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ شیعہ خاندان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں آنکھ کھلتے ہی روایت ہوتی ہے کلام ہوتا ہے، ردہم ہوتا ہے، لے ہوتی ہے، جذبہ ہوتا ہے، دکھ ہوتا ہے، میر انیس ہوتا ہے۔ پروین اسی

ماحول میں پل کر جوان ہوئی، پھر قدرت نے اس میں تخلیقی کلی ٹانک دی۔ تخلیقی صلاحیت ہوتی تو خوب ہے لیکن المیہ اثرات کی حامل ہوتی ہے۔ نارمل زندگی بسر کرنا ممکن نہیں رہتا۔''(۳۰)

پروین شاکر کے ظاہر و باطن پر ممتاز مفتی کا قلم یو گہر باری کرتا ہے۔

''باہر سے دیکھو تو وہ نازک اندام دھان پان لڑکی نظر آتی ہے۔ قریب جاؤ تو منظر یکسر بدل جاتا ہے۔ آپ کے روبرو ایک بالغ العقل، ہوش مند زیرک، منفرد خیالات، اور مضبوط کردار کی خاتون بیٹھی ہوگی وہ سہارے سے بے نیاز ہے ہر بات میں منفرد رائے رکھتی ہے مگر سہارا مل جائے تو کفران نعمت نہیں کرتی، تکلیف دہ دکھ بھرے ماضی کے باوجود اس کے اندر امید کا دیا روشن ہے۔''(۳۱)

پروین شاکر کے شعری مزاج کی والد اور نانا کے علاوہ استاذ ماہر عروج سید حسن عسکری اور احمد ندیم قاسمی نے سرپرستی فرمائی۔ پروین شاکر نے شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود ان اساتذہ اور شعراء کا بہت ہی احترام کیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر ان خوبیوں کے متعلق لکھتے ہیں۔

''پروین شاکر کے نام کا ڈنکا بجتا تھا مگر اسے ناموری کا نشہ نہ چڑھا اسی لیے اس نے اپنے سینئرز اور معاصر شعراء کا نام ہمیشہ احترام سے لیا۔ احمد ندیم قاسمی کی انگلی پکڑ کر جس تخلیقی سفر کا آغاز کیا تھا اس کے اختتام تک پروین نے اپنے عمو کا احترام کیا۔ شہرت کے سفر میں اس نے سفر کے ساتھیوں کو مستعمل کپڑوں کی طرح پھینک دینے کے برعکس ان سے محبت، خلوص، اور احترام کا رشتہ استوار رکھا۔''(۳۲)

پروین شاکر نے اپنی زندگی کے تخلیقی سفر میں جذبے، احساس، اور شعور کے بڑے فاصلے طے کیے اور اپنے شعری کائنات کی روداد کو دنیا کے سامنے پانچ شعری مجموعوں خوشبو، صد برگ، خود کلامی، انکار اور کف آئنہ کی شکل میں ادبی دنیا کے دسترخوان پر سجا دیا۔ کم سنی میں ہی ان کی پہلی کتاب خوشبو شائع ہوئی جس کی پزیرائی نے انہیں شہرت و مقبولیت کے نقطۂ عروج پر پہنچا دیا جس کے بعد ان کا ارتقائی سفر جاری و ساری رہا۔ احمد فراز،

سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی نے بھی ان کی تازہ کاری کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں داد سے نوازا۔ انہوں نے اپنی فنی صلاحیت اور استعداد کے بل پر نوعمری میں ہی پانچ بڑے ایوارڈ حاصل کیے جو شاید کسی بھی عہد یا کسی بھی عمر میں اردو شاعرہ کو نصیب نہیں ہوا۔ ۱۹۷۸ء میں خوشبو پر آدم جی ایوارڈ جو پاکستان میں بڑا ایوارڈ تصور کیا جاتا ہے، جس کی بہت ہی اہمیت ہے۔ ۱۹۸۵ء میں انہیں ڈاکٹر اقبال ایوارڈ برائے ادب دیا گیا جو کہ اپنے معیار اور وقار کے اعتبار سے عظیم ایوارڈ ہوتا ہے۔ ۱۹۸۶ء میں انہیں یو.ایس.آئی.ایس. ایوارڈ تفویض کیا گیا اور ان سب سے بڑا ایوارڈ فیض احمد فیض انٹرنیشنل ایوارڈ سے انہیں نوازہ گیا۔ حکومت پاکستان کا سب سے بڑا ایوارڈ پرائیڈ آف پرفارمنس نے بھی پروین شاکر کا قدم چوما لیکن پروین شاکر کی شاعری ان تمام اعزازات اور ایوارڈ سے بڑی تھی کیونکہ وہ رحم انسانیت اور احترام آدمیت کی شاعری تھی۔ لیکن ان اعزازات نے ان کی حوصلہ افزائی ضرور کی جو کسی بھی فن کار کے فن کو نکھار سکتا ہے۔

انگریزی ادبیات کی گہری واقفیت کی بنا پر نمائندہ انگریزی شعرا تک پروین کی دست رس تھی جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں ہندوستانیت اور فارسیت کے علاوہ انگریزی رنگ و آہنگ بھی دکھائی اور سنائی دیتے ہیں۔ قافیوں کے استعمال میں مکمل طور پر آزادی برتنے والی پروین شاکر نے اپنی شعری مجموعوں کے سلسلے میں کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا اپنے مجموعوں کے آغاز میں پیش لفظ یا تعریفی کلمات کے لیے کسی کا احسان لینا پروین کی خودار شخصیت کو راس نہیں آیا اور خوشبو سے لیکر انکار تک انہوں نے پیش لفظ مختلف عنوانات سے خود ہی لکھا اور اتنا خوب لکھا کہ وہ تحریر شعری کائنات پر بھاری پڑ رہی ہے اور مجموعے کی تفسیر و تلخیص کا حق بھی ادا کر رہی ہے۔ یہ اچھوتا انداز قاری کو اپنی طرف مائل کر لیتا ہے۔ پروین شاکر اپنی پوری زندگی میں غالباً تین بار ہندوستان آئیں۔ پہلی بار اپنے والدین کے ہمراہ ۱۹۶۳ء میں۔ ڈاکٹر ناظم جعفری کی شادی میں بنارس آئیں اس وقت ان کی عمر صرف ۱۱ سال تھی۔ دوسری مرتبہ ۱۹۷۸ء کے بزم شنکر و شاد میں شرکت کے لیے ہندوستان

آ ئیں ۔اس مرتبہ بنارس، دہلی، اور ممبئی اور بہار میں بھی ان کا قیام رہا۔ وہ بحیثیت شاعر مشہور ہو چکی تھیں اور ہندوستان کے مشاعروں میں بھی شرکت کر کے اپنا کلام بھی سنایا تھا۔

مارچ ۱۹۷۸ء کے آخر میں دہلی میں شنکر وشاد کا جو مشاعرہ منعقد ہوا تھا اس میں پروین شاکر کی شرکت اور کلام کے متعلق مجتبیٰ حسین صاحب رقمطراز ہیں۔

اس مشاعرے کی سب سے اہم خصوصیت پاکستان کی نوخیز شاعرہ پروین شاکر کی شرکت تھی جب ہم سے تعارف کرایا گیا تو ہم نے دل ہی دل میں سوچا ایسی دھان پان کی لڑکی کیا شعر کہہ سکے گی۔ جب اس مخصوص بیٹھک میں ان کے شعر سنانے کی باری آئی تو ہم نے فرمائش کی کہ ترنم سے کلام سنائیں اس پر بولیں معاف کیجئے۔ میں ترنم سے محروم ہوں پہلی بار ہم نے ایک خاتون کو تحت اللفظ شعر کہتے ہوئے دیکھا اور سنا۔ پروین شاکر نے اپنی وہ مشہور غزل سنائی جس کا مطلع ہے۔

پا بہ گِل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون

دست بستہ شہر میں کھولے میری زنجیر کون

غزل ختم ہوئی تو ہمارے دوست بشیر بدر نے کہا کہ محترمہ آپ نے ایسی مردانہ غزل سنائی کہ ہمیں چوڑیاں پہن لینی چاہیے۔ اس پر پروین نے کہا ایسی بات ہے تو آپ کو ایک زنانہ غزل سناتی ہوں۔ پھر پروین نے سچ مچ ایک زنانہ غزل سنائی اور یوں ہمارے دوست کے ہاتھوں میں سے چوڑیاں اتار لیں۔'' (۳۴)

تیسری مرتبہ وہ ۱۹۹۰ء میں ہندوستان آئیں اور رنجیت ہوٹل دہلی میں ٹھہری تھیں۔ ہندوستانی کلچر انہیں بہت ہی عزیز تھا۔ ان کو بھوجپوری زبان سے کافی لگاؤ تھا کیونکہ یہ ان کے آباء واجداد کے زمین کی زبان تھی۔ پروین شاکر نے بنارس کی مندروں میں جا کر جس میں مانس مندر قابل ذکر ہے ہندو مائیتھالوجی اور ہندوستانی کلچر کو قریب سے جاننے کی کوشش کی۔ ہندوستان میں علی سردار جعفری، شبانہ اعظمی اور جاوید اختر نے بھی ان کے

قریبی مراسم تھے اور ہندوستان ان کی علمی دوستی کی قدر کرتا تھا۔

پروین شاکر کی شخصیت بہت ہی جاذب، پرکشش اور تہدار تھی۔ انہوں نے بیک وقت کئی گراں قدر کارنامے انجام دیے اور زندگی کے ہر محاذ پر بہت ہی اعتماد اور استقلال کے ساتھ ڈٹی رہیں۔ ان کی سیرت وشخصیت، محنت ومحبت کو جاننے کے لیے عبدالاحد ساز نے ناظم آباد کراچی پاکستان میں ان سے ایک تفصیلی انٹرویو لیا جس سے ان کی صلاحیت اور شخصیت کی بہت سی پوشیدہ خوبیاں سامنے آتی ہیں۔ یہ انٹرویو قومی آواز بمبئی میں ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا اور بعد میں اس انٹرویو کے اقتباسات متعدد رسائل وجرائد میں بھی شائع ہوئے جس سے اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ہوتا ہے اس انٹرویو کے چند ٹکڑے یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔ جس سے ان کی شعری شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔

بمبئی کے جواں شاعر عبدالاحد ساز نے پروین شاکر کے متعلق لکھا کہ!

''پروین شاکر بلاشبہ اپنی شخصیت اور فن کے گہرے نقوش چھوڑ جانے والی ایک ایسی خاتون تھیں جسے قدرت نے حسن وجمال علم وہنر اور ثروت ومنزلت سے ایک ساتھ نواز رکھا تھا اس نے شاعری اور فن سے ٹوٹ کر محبت کی اور خود بھی اپنے عہد کی شاعری کی آنکھوں کا تارہ بن کر رہی۔'' (۳۴)

حسن وجمال، ذہانت وفطانت شعر گوئی کا ملکہ جذبات کے اظہار پر قدرت، شائستگی اور برجستگی کے باوجود بھی پروین شاکر اکثر وبیشتر اپنے آپ میں کھوئی ہوئی رہتی تھیں۔ ان کا یہ انداز بھی ملاحظہ ہو۔

اکیلے واک کرتے وقت وہ اکثر اپنے آپ سے باتیں کرتیں ان کا خیال تھا کہ انسان کے اندر کچھ تلخی ہونی چاہیے لیکن خود اس میں تلخی نہیں تھی اس بات پر وہ افسوس بھی کرتیں۔ وہ اپنے آپ کو بالکل نارمل نہیں سمجھتی تھیں ان کے خیال میں کوئی بھی شاعر نارمل نہیں ہوتا اگر یہ پاگل پن نہ ہوتا تو نہ کوئی شیکسپیئر پڑھتا نہ مسجد قرطبہ، اس لیے وہ معاشرے میں کچھ لوگوں کا ابنارمل ہونا ضروری سمجھتی تھی جو لوگ چلتے پھرتے گھومتے شعر لکھتے ہیں

اس پر انہیں حیرانی ہوتی اس لیے کہ وہ خود ایسی نہیں تھیں۔''(۳۵)

خاموشی اور خود اعتمادی ہی پروین شاکر کا سب سے کارگر ہتھیار تھا۔ جس کے ذریعہ وہ ویسٹ لینڈ کو قابل کاشت اور زندگی کو قابل برداشت بناتی ہیں جس کے متعلق آفتاب احمد رقمطراز ہیں۔

''پروین شاکر کی شخصیت میں خود اعتمادی پائی جاتی ہے اور جس کی جھلکیاں ان کی شاعری میں بھی موجود ہیں۔ اسی کے سہارے انہوں نے زندگی میں ہر طرح کی مشکلات کا مقابلہ کیا ہے۔ سر ہمیشہ اونچا رکھا ہے اور گیت بننے اور خوشبو پھیلانے میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے دی۔''(۳۶)

پروین شاکر کی بیشتر زندگی اداسیوں، پریشانیوں اور آزمائشوں میں گزری ان کے خواب چکنا چور ہوئے اور خوشیاں کافور ہوئیں جس کی وجہ سے ان کی شخصیت میں اداسی کا عنصر غالب رہا۔ وہ اپنی ذات سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ!

''مجھے اداس رہنے کا کوئی شوق نہیں لیکن اگر زندگی نے آپ کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تو آپ نسبتاً اپنے ساتھ تو دیانت سے رہیں گے میں اداس تو نہیں لیکن سنجیدہ ضرور ہوں ایسی نہیں ہوں کہ میرے اندر مزاح کی حس نہ ہو۔ میں زندگی سے لطف اندوز ہوتی ہوں حتی کہ میرے دفتر میں بہت مختلف قسم کا کام ہے وہاں بھی اپنے لیئے ریلیف ڈھونڈھ لیتی ہوں۔ I enjoy life۔''(۳۷)

پروین شاکر اچھی شاعرہ کے ساتھ ساتھ اچھی مقرر بھی تھیں لیکن انہوں نے دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب میں ہی بھلائی سمجھی۔ کیونکہ دونوں کی راہیں جدا ہوتی ہیں وہ کہا کرتیں کہ تقریر انسان کو ہجوم کی طرف لے جاتی ہے اور شاعری تنہائی کی طرف، چونکہ پروین شاکر تنہائی پسند تھیں اس لیے شاعری کی طرف آ گئی۔ تنہائی کو وہ ایک ایسی چیز سمجھتی تھیں جس کے حوالے انسان اپنے آپ سے ملتا ہے۔ لیکن یہ حوصلہ مندوں کا کام ہے۔ فنکار کے لیے اس کا خیال تھا کہ اسے پہلے اپنے آپ سے ملنا چاہیے پروین شاکر خوشی کے تصور کے متعلق

کہتی ہیں کہ!

''خوشی وہ ہے جو زندگی کو Worth living بنا دے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو زندگی کا Prospectus ہی بدل دیتی ہے۔'' (۳۸)

محبت کے بارے میں خیال!

''پروین شاکر کی نظر میں محبت یہ ہے کہ جب انسان خود کو کسی کے بغیر ادھورا یا نامکمل محسوس کرنے لگے اور اس کا دل چاہے کہ اس سے اپنے دل کی بات کہہ ڈالے، تب محبت ہوتی ہے۔''

عشق کے بارے میں خیال!

''عشق کے بارے میں بھی پروین شاکر کا نقطۂ نظر اوروں سے مختلف ہے وہ عشق کو صرف عورت اور مرد ہی کے درمیان تصور کرتی ہیں کسی ایسی شخصیت سے جو اساتذہ جیسے زمرے میں شمار کیے جاتے ہوں ان سے عشق نہیں ہوتا بلکہ عقیدت ہوتی ہے اس سوال پر کہ عشق ایک دم ہوتا ہے یا Grow کرتا ہے پروین کا جواب یہ ہے کہ یہ تو کسی شخص پر منحصر ہے کچھ لوگوں کے ساتھ آپ ایک عرصے سے رہ رہے ہیں اور آپ کو پتا نہیں چلتا ہے کہ آپ کو ان سے عشق ہے اور بعض اوقات Thunder and lighting والا معاملہ ہوتا ہے لیکن زیادہ تر پہلے والا کیس ہوتا ہے۔

نظریۂ شعر و ادب!

تخلیق شعر و ادب کو پروین شاکر ایک اہم ترین فعل تصور کرتی ہیں ادبی تخلیق کے مشغلے سے متعلق ان کا خیال تھا کہ شاعر جو اپنی تخلیق سپردِ قلم کرتے ہیں وہ یونہی بے کاری کا مشغلہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے تخلیق کار کو ذہنی آسودگی ملتی ہے یہ بجائے خود ایک بڑا اہم کام ہے۔ اپنی تخلیقات کی اہمیت سے متعلق پروین شاکر نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جو قابلِ ذکر بھی ہے اور قابلِ فکر بھی۔ ہوا یوں تھا کہ جس وقت پروین شاکر کراچی کسٹم

ہاؤس میں تعینات تھیں تو اسے فیصل آباد ڈسٹرکٹ جیل سے ایک قیدی کا خط آیا جسے موت کی سزا ہو چکی تھی اس قیدی نے اپنی ساری سچویشن بیان کرتے ہوئے پروین شاکر کو لکھا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ پروین کی شعری تصنیف پڑھنا چاہتا ہے عام طور پر پروین خطوط کے جواب نہیں دیا کرتی تھی لیکن اس خط کا جواب دیا اور لکھا کہ

''مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ آپ کس کیس کے تحت اندر ہوئے ہیں اور یہ صحیح بھی تھا کہ نہیں لیکن مرنے سے پہلے آپ کی جو خواہش ہے اسے پورا کرنے کے لیے یہ کتاب بھیج رہی ہوں۔'' (۳۹)

اپنی کتاب کو قیدی تک پہنچانے کے لیے درمیان میں ایک اے. ایس. پی. تھا جس سے رابطہ قائم کر کے پروین شاکر نے اپنی کتاب اس تک پہنچائی اور یہ کتاب اسے مل بھی گئی جس کی پروین شاکر کو انتہائی خوشی ہوئی کہ دنیا سے گزرنے سے پہلے اس قیدی کی جو خواہش تھی اسے پروین نے پورا کیا۔

شاعرات کے شعری رویے پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروین شاکر نے کہا تھا کہ!

''شاعری اپنے ماحول اور زمین سے پھوٹتی ہے ہمارے یہاں میرابائی کی روایت تو تھی جہاں عورت شعر کہتی ہے اور اسے اپنے عورت ہونے پر کوئی شرمندگی نہیں ہے اور وہ اپنے محبوب کی شخصیت، اس کے لباس، اس کے مزاج، اس کے طور طریقے سبھی کچھ شعر میں بیان کرتی ہے یہ بات آپ کو دکنی شاعری میں بھی ملے گی۔'' (۴۰)

پروین شاکر اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ!

''محبت اس کی شاعری کا مرکز ہے لیکن جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے اور مشاہدات کی نوعیت بدلتی ہے تو محبت کا استعارہ سارے معاشرے، ملک بلکہ ساری دنیا کو اپنی معنوی تہوں میں سمیٹ لیتی ہے۔'' (۴۱)

غزل کے بارے میں پروین شاکر کا خیال تھا کہ!

''غزل تو امکانات کے معاملے میں اتنی مستحکم ہوگئی ہے کہ اس کے بارے میں زیادہ بحث کی گنجائش

نہیں۔ غزل نے ہر صدمہ سہا اس کے باوجود جانبر ہو کے رہی۔'' (۴۲)

شاعرات کے تاریخی پس منظر پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروین شاکر نے کہا تھا کہ!

''شعر کہنے والی عورت کو اردو معاشرے نے آہستہ آہستہ اب قبول کیا ہے۔ پرانے وقتوں کی بیشتر شعر کہنے والی عورت یا تو بیگمات اور شہزادیاں ہیں یا پھر ان کا تعلق بالا خانوں اور کوٹھوں سے ہے یا وہ دیویاں ہیں یا گڑیاں ہیں ایک جیتی جاگتی Living عورت ہمیں نہیں ملتی یہ سانس لیتی عورت ہمیں جدید اردو شاعری میں دستیاب ہوتی ہے۔'' (۴۳)

شاعروں کی غربت کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ!

''معاشرے میں شاعر کو جائز حیثیت ملی ہی نہیں اسے تفریح کا سامان بنا دیا گیا ہے اسے پوسٹ ڈیٹز آئیٹم کی حیثیت دے دی گئی مگر اس کے بعد کچھ بھی نہیں۔ اب تو شاعروں، آرٹسٹوں اور فنکاروں کو امپورٹ کیا جاتا ہے جس کے لیے انٹرنشنل مشاعروں کا اہتمام اور اس کے علاوہ بھی دیگر تقاریب، کنیڈا، یو.ایس،اے. اور انگلینڈ وغیرہ کے مشاعرے تو معمول بن گئے ہیں۔'' (۴۴)

عشق کے معیار کے متعلق پروین شاکر کہتی ہیں!

''عشق میں معیار سے متعلق پروین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان جب کسی سے عشق کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کوئی معیار ضرور ہوتا ہے کوئی ایسا امیج جس سے انسان محبت کرتا ہے اور زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے لیکن یہ اتفاق کی بات ہے کہ انسان کا مطلوبہ معیار اسے کہیں مل جائے مگر ایسا کم ہوتا ہے۔ مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ آدمی تلاش میں ہی رہتا ہے۔'' (۴۵)

خوشبو کی شاعرہ خوشبو میں بسے ہوئے شعر تو خوب کہتی تھیں لیکن خوشبو سے محتاط بھی رہتی تھی۔ وہ خوشبو بہت کم پسند کرتی تھیں اور اگر لگاتی بھی تھیں تو بہت ہلکی جو موسم اور وقت سے مناسبت رکھتی ہو۔ ان کی صبح اور

شام کی خوشبوئیں بھی الگ الگ ہوتی تھیں اور جب یہ یکجا ہو جاتی تو پروین شاکر بن جاتی تھیں یعنی خوشبوؤں کی سفیر پروین شاکر نے سرکاری مصروفیات کے ساتھ ساتھ روزنامہ جنگ میں کالم نویسی کا کام بھی بخوبی انجام دیا اور پاکستان ٹیلیویزن کے لیے ''سخن ور'' کے عنوان کے تحت اردو کی ممتاز شخصیتوں کے انٹرویو بھی لیے تھے۔ اردو ادب کی چند شخصیتوں کو ان کے سوالات کے آگے پسینہ میں شرابور ہوتے ہوئے دیکھا گیا۔

گیتانجلی البم

گیتانجلی سِکھ گھرانے کی ایک لڑکی تھی۔ والدین نے اس کا نام ٹیگور کی کتاب گیتانجلی پر رکھا۔ اس لڑکی نے ۱۲؍جون ۱۹۶۱ء میں آنکھیں کھولیں اور سولہ برس کی عمر میں ۱۱؍اگست ۱۹۷۷ء کو اس کا انتقال بمبئی میں ہوا۔ اس کی بیشتر زندگی بمبئی میں ہی گزری وہ کینسر کی مریضہ تھی۔ اسی جان لیوا مرض میں مبتلاء گیتانجلی نے کئی سو انگریزی میں نظمیں لکھیں اور ہر نظم میں موت کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔ پروین شاکر نے گیتانجلی کی ان نظموں کو اردو میں ترجمہ کیا۔ ان تراجم کو احمد سلیم نے مرتب کیا اور ۱۹۹۵ء میں پروین قادر آغا نے شائع کیا یہ ترجمہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

گیتانجلی چونکہ کینسر کی مریضہ تھی اس نے اپنی طے شدہ موت کے احساس سے وابستہ خوف ختم کرنے کے لیے شاعری سے تقویت حاصل کی اور شاعری کو دوا اور دعا کے لیے استعمال کیا ہوگا۔ مگر پروین شاکر تو خوشبو کی شاعرہ تھی اس نے دنیا بھر کی شاعری چھوڑ کر ایک گمنام لڑکی کی نظمیں ہی ترجمے کے لیے کیوں منتخب کیا۔ کینسر کی اذیت کو گیتانجلی برداشت کر رہی تھی۔ پروین شاکر تو کینسر کی مریضہ نہ تھی کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کامیاب شاعرہ کی روح کو اندوہ کا کینسر رہا ہو۔ وہ کینسر جس سے صرف بیگانے ہی نہیں بلکہ اپنے بھی بے خبر رہتے ہیں کیونکہ جس عمر میں لڑکیاں رومانی لیٹریچر پڑھتی ہیں جذباتی فلمیں دیکھتی ہیں، زلفیں بے وجہ کھلتی ہیں اور ہونٹ بے بات مسکراتے ہیں اس عمر میں گیتانجلی آنے والی موت کے کرب سے مقابلے کے لیے صرف شاعری کا

سہارا لے رہی تھی۔ تمناؤں، خوابوں اور خواہشوں کی شاعرہ پروین شاکر بھی سپنے دیکھنے والی ایک دوشیزہ شاعرہ تھی مگر دفتر کی مصروفیات زندگی کے تضادات، ذاتی پریشانیوں، حالات کی تلخیوں نے اسے خوشبو سے انکار تک پہنچا دیا۔ اس نے آنچل کو پرچم اور قلم کو ہتھیار بنایا اور نسائی جنگ میں کود پڑی تاکہ آنے والی بنت حوا کی تمام نسلیں اس بندش، تضادات اور دوسرے معیار کے کینسر سے نجات پاسکیں لیکن اس میدان میں بھی وہ ٹوٹی ہوئی اور شکست خوردہ دیکھائی دیتی ہیں اور موت ہی انہیں زندگی کا مکمل حل دیکھائی دیتا ہے وہ کہتی ہیں۔

تیار ہوں موت سے دوچار ہونے کے لیے

وہ جب اور جہاں ظاہر ہو

موت ایک معزز مہمان ہے

وہ اپنی مرضی سے نہیں آتی

وہ تو خدا کا حکم بجالاتی ہے (نظم تیار ہوں کا ایک ٹکڑا)

خوابوں کے ٹوٹنے اور معاشرہ سے لڑنے کی اذیت کا ذکر کرتے ہوئے پروین شاکر کہتی ہیں۔

جس طرح خواب میرے ہوگئے ریزہ ریزہ

اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی

ذاتی پریشانیوں کرب اور تکلیف کا ذکر اس طرح کرتی ہیں۔

ایک عمر ہوئی ہے خود سے لڑتے

اندر سے تمام تھک رہی ہوں میں

اور پھر یہ شعر ملاحظہ ہو!

اب یاد نہیں کہ زندگی میں

میں آخری بار کب ہنسی تھی

بے چارگی اور بے بسی کی حد تو اس وقت ہو جاتی ہے جب یہ شعر کہتی ہیں۔

مرا نوحہ کناں کوئی نہیں ہے

سوا اپنے سوگ میں خود بال کھولوں

پروین شاکر کی اس مایوس کن زندگی میں موت کا تصور بار بار آتا ہے جب کہ اس کا کینوس بہت وسیع نہ تھا جس میں موسموں کے رنگ، سمندروں کی نیلاہٹ، چڑیوں کی چہچہاہٹ، میدان جنگ کی جھنکار، دفتروں کی زود اکتاہٹ، آفیسر کے جبر اور گھر والوں کی تنہائی شامل تھی لیکن دنیاوی اعتبار سے ان کے پاس وہ تمام چیزیں تھیں جو سکونِ قلب کا باعث بنتی ہیں لیکن اس شاعرہ کو بار بار موت کا انتظار کیوں، اس کے بارے میں سلیم اختر رقمطراز ہیں۔

''دراصل پروین شاکر جیسی شاعرہ کے حوالے سے موت کا تصور آسان نہیں اس لیے دنیاوی نقطۂ نظر سے اسے سب کچھ ملا تھا۔ منصب، شہرت، عزت، دولت، میڈیا کی محبوبیت، اوارڈ، غیر ملکی دورے، پاکستانی ادیب عمر بھر ان میں سے ایک یا دو[۲] کے حصول کے لیے ہی کباب سیخ بنے رہتے ہیں۔ جب کہ پروین نے نہایت تیز رفتاری سے ان سب قلعوں پر اپنا آنچل لہرا دیا بلکہ بطور فاتح اپنا پرچم لہرا دیا اس لیے کلام میں دکھ کرب، پژمردگی اور موت کے اشعار کے باوجود بھی موت پسند پروین شاکر کا تصور آسان نہ تھا اپنے شعری مجموعہ انکار کی نظم ''پروین قادر آغا'' میں پروین شاکر نے یوں لکھا تھا۔

مجھ میں اور پاگل پن میں

بس ایک رات کا فاصلہ رہ گیا تھا

خودکشی بھی میری تاک میں بیٹھی تھی

قریب تھا کہ

میں اس کے ہاتھ آجاتی

بالآخر خوشبو کی شاعرہ اور موت پسند پروین شاکر کا ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء صبح ۹:۳۰ پر فیصل چوک اسلام آباد میں ایک کار حادثے میں انتقال ہو گیا۔ وہ صبح اپنے ڈرائیور محمد یوسف کے ساتھ اپنی کار میں دفتر کے لیے روانہ ہوئیں دھند آمیز فضا، تیز بارش، سخت سردی، اور کہر آلود صبح تھی، سامنے سے آ رہی بس نے ٹکر مار دی۔ ڈرائیور نے تو اسی لمحہ دم توڑ دیا جب کہ پروین شاکر شدید زخمی حالت میں اسپتال لے جائی گئیں وہاں ۱:۳۰ پر وہ انتقال کر گئیں۔ انہیں ۲۴ر دسمبر ۱۹۹۴ء بروز پیر اسلام آباد کی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے پسماندگان میں بوڑھی ماں، بڑی بہن اور ایک بیٹے کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

پروین شاکر کی بڑی بہن نسرین شاکر نے پروین کی ناگہانی موت پر ایک نثری نظم تحریر کی، جس سے ان کے دکھ اور تاثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اجل کی دستک میری ساعتوں سے گزر کر
میرے نفس کی آمد کو حصار کر رہی ہے
میرے قلب کا فشار مجھ کو گواہی دے رہا ہے
کہ اس نے ماہ تمام کی شب کو
میری خاک کو غبار کرتے
میرے کالم کو مشکبار کرتے
خزاں کے صد برگ پتوں کو
سرگوشیوں میں خود کلامی کرتے ہوئے سنا ہے
کہ اب انکار کی تلخیوں کا ذائقہ
کوثر کی لازوال شیرینی سے مٹنے والا ہے

میری یادوں کی خوشبو کو

بادل، بارش، اور ہوائیں

کو بکو پھیل کر

دھرتی کے پیرہن کو رچانے بسانے والی ہیں

میری روح کو غیبی خراج سنانے کے لیے

وہ نقش کر رہا ہے

حسین ستاروں دلوں کے ملہار سروں کو

اف یہ سرد ٹھٹھرتی سناٹی راتیں

میرے وجود کے پامال تک اتر چکی ہیں

میں کس کی منتظر ہوں

مگر اے دعائے نیم شبی سننے والے

قبول کرنے والے

تو میرے نور چشم کے حلقہ انوار میں دیکھ تو سہی

اے ساقی حیات بس

اے ساقی رحمت

رحمتوں سے مایوسی میری عادت نہیں

پروین شاکر کے حادثے کے بعد لاہور میں پروین شاکر کی یاد میں ''ادارہ معاصر'' کے زیر اہتمام ایک قومی ادبی کانفرنس ہوئی، جس میں اے.این. پی. کے صدر اور ممتاز ادیب و دانشور اجمل خٹک مہمان خصوصی

تھے۔عطاء الحق قاسمی کنویز اور اشفاق احمد نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔جس میں ملک کے تمام نامور شعراء و دانشوروں نے شرکت کی ،شعراء نے جن الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ان کے چند اشعار عنوان کے ساتھ یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔ تاکہ شعراء کے رنج و غم کا احساس ہو سکے۔

مظفر وارثی آہ پروین کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

آہ پروین

جمال ذات کی تشریح تھا ہنر اس کا

خود اپنے خوں سے ہے آراستہ سفر اس کا

وہ کوہ قاف محبت کی رہنے والی تھی

دلوں میں تاج محل کی طرح ہے گھر اس کا

ہواؤں میں جو نکلتی تھی خوشبوؤں کی طرح

رکھا ہے خاک کے تکیئے پہ آج سر اس کا

دکھائی دیتی رہے گی وہ اپنے قاری کو

سخن سخن میں ہے اک لہجۂ نظر اس کا

نہ تھا تعلق خاطر بھی اس قدر اس کا

ہوا ہے رنج مظفر کو جس قدر اس کا

نو ر بجنو ر ی یو ں لب کشا ہیں !

پروین شاکر

خوشبو ں کی شاعرہ

اپنی زلفوں میں بسائے عود عنبر کی مہک

اپنی پیشانی پہ فکر و فن کی تابانی لیے

اس کی آنکھوں میں کئی ماہ تمام

اس کے ہونٹوں پہ ہزاروں کہکشائیں

اس کے پیکر میں قلوپطرہ کا پندار جمال

اپنے دامن میں سجائے ان گنت رنگوں کے پھول

اپنے ہاتھوں میں اٹھائے جگمگاتی مشعلیں

دفعتاً ہر رنگ ہر خوشبو سے ناطہ توڑ کر

ہر کرن کو چھوڑ کر

یک بیک کوہ ندا کو چل پڑی

ماجد صدیقی نے پروین شاکر کے نام عنوان لکھا

﴿پروین شاکر کے نام﴾

خوشبو کی وہ ہمجولی سیاروں سا نام اس کا

یکبار گی ٹوٹا ہے کیوں ماہ تمام اس کا

صد برگ ٹھہرنے کو اس گل نے بکھرنا تھا
کیوں نام کیا اپنے جو بھی تھا پیام اس کا
وہ مرگ سے بھی شاید انکار نہ کر پائی
اس تک بھی پہنچنا تھا آخر کو سلام اس کا

گفتار خیالی اجل کے راہزن کے عنوان سے لکھتے ہیں

اجل کے راہزن

لہو آشام لمحوں کا یہ کس پر قہر ٹوٹا ہے
یہ کس کا سوگ ہے
کہ چرخ رویا بادلوں نے بال کھولے ہیں
یہ کیوں ماتم کناں ہیں
لفظ، کاغذ اور قلم میرے
بنے معبود احساسات کیوں
کوئی سر بگریباں خوشبوؤں کو یاد کرتا ہے
کوئی صد برگ لے کر ہاتھ میں فریاد کرتا ہے
زبان بے بسی پر خود کلامی بین کرتی ہے
لیے انکار آنکھوں میں زمانہ طفل گریاں کی طرح مٹی میں لت پت ہے
نہ ایک سد سہارا ہے نہ سر پر آس کی چھت ہے
بس ایک مرگ تکلم ہے

بلقیس محمود اس انداز میں ماتم کناں ہیں

﴿پروین شاکر﴾

اے شہر حسن پرور

اے شہر امن و آسائش

تیرے دامن پہ زندہ خون کے چھینٹے

عدالت چاہتے ہیں

مسلسل خون کے آنسو بہاتے ہیں

مدعی

حسن بیاں

حسن قلم

حسن تخیل

حسن منظر کے

عدالت چاہتے ہیں

اے پاکستان کے گلشن

تو اپنے سیکڑوں پھولوں گلابوں کا

امیں ہے

قلم کاروں کی دنیا کا

وہ تنہا اک گلاب تازہ

خوشبو جس کی اک دنیا میں پھیلی

تو نے اس کو نہ سنبھالا

ہماری پھول جیسی شاعرہ کو مار ڈالا

تو اوروں کا تحفظ کیا کرے گا

تو اب کس حسن کا چرچا کرے گا

گلستان ادب کے

دور تک اجڑے ہوئے لمحے

عدالت چاہتے ہیں

عدالت چاہتے ہیں

عدالت.............

جمشید چستی ایک نوحہ گر تیرا کے عنوان سے یاد کرتے ہیں

اک نوحہ گر تیرا

مجھ میں زندہ ہے سخن گر تیرا

ڈھونڈھتا ہے تجھے پیکر تیرا

تھا تبسم تیرا پوشاک تیری

گفتگو تھی تیری زیور تیرا

تیری خوشبو تیری تنہائی تھی

خود کلامی تھی مقدر تیرا

تیرے گردوں پہ تیرا ماہ تمام

تیرے ماتھے پہ ہے جھومر تیرا

شیخ عطاء اللہ جوہر انہیں اس انداز میں یاد کرتے ہیں۔

﴿پروین شاکر کی یاد میں﴾

ہماری بزم میں آ کر چلا گیا ہے کوئی

جہانِ عشق بسا کر چلا گیا ہے کوئی

بہار اپنی دکھا کر چلا گیا ہے کوئی

نئے گلاب کھلا کر چلا گیا ہے کوئی

اسی کی خوشبو سے مہکا کریں گے شام وسحر

چمن میں رنگ جما کر چلا گیا ہے کوئی

ناہید قمر ''ہوئی رزق ہوا خوشبو'' کے عنوان سے رقمطراز ہیں۔

﴿ہوئی رزق ہوا خوشبو﴾

محبت کی زباں کی شاعرہ نے

خون کی قیدی نگاہوں پر

نزولِ خواب اور اس خواب کی تعبیر کو آسان بنایا تھا

وہ جیسے، تتلیوں، پھولوں، ہواؤں، جگنوؤں

اور بارشوں کے ساتھ چلنے کا ہنر سب کو سکھایا تھا

وہ خود بھی خواب لگتی تھی

ایک ایسا خواب جس کے ہاتھ سے

روشن لکیریں چاہے مٹ جائیں

یہ جس کے منظروں کے رنگ کبھی پھیکے نہیں پڑتے

وہ جس نے عمر بھر

ہم راہیوں سے اک قدم آگے ہی رکھا تھا

یہاں بھی دوسروں سے ایک قدم پہلے اٹھا کر

جانے اپنے کون سے ایک خواب کی

تعبیر بننے ایک انجانی سی دنیا کی طرف چل دی

اس عظیم شاعرہ کی حادثاتی موت پر ہندوپاک کے متعدد ادبا وشعراء نے اظہار افسوس کرتے ہوئے تعزیتی خطوط لکھ کر ان کی قدر و منزلت کا اعتراف کیا۔ ہم یہاں کتابچہ خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر کے حوالے سے کچھ ایسی شخصیتوں کے خطوط نقل کر رہے ہیں جنہیں کاخ شعروادب کا ستون تصور کیا جارہا ہے۔

ممتاز ادیب اور مشہور ترین شخصیت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا!

''جدید شاعری کا منظرنامہ پروین شاکر کے دستخط کے بغیر نامکمل ہے''

مشہور شاعر جناب احمد فراز نے پروین شاکر کی اندوہناک موت پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ آج اردو شاعری میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پروین شاکر اپنے دور کی بڑی انسان تھیں۔ انہوں نے خوشبو کے سفر سے اپنا آغاز کیا اور ماہ تمام پر یہ روشن آفتاب ڈوب گیا۔ احمد فراز نے رنجیدہ لہجے میں کہا کہ مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ نرم لفظوں میں گفتگو کرنے والی اور عزت واحترام کی علامت پروین آج ہمیں چھوڑ گئیں ہیں۔ انہوں نے کہاں کہ پروین شاکر کی شاعری اردو شاعری میں ایک نئی روایت تھی۔ اس نے عورت کے خالص ترین جذبات کو اپنی شاعری میں اس طرح سمویا کہ شاعری ایک انوکھا روپ اختیار کر گئی۔ انہوں نے کہا کہ میں اس کی کس کس خوبی کی تعریف کروں۔ وہ جامع صفات تھی اس کا لہجہ اس کی شاعری اس کا رکھ رکھاؤ اور اس کی ذہانت سب کچھ منفرد تھا۔ ایک بڑی عورت تھی اور بڑے لوگوں کی طرح کوئی اسے ختم نہیں کرسکتا۔

پروین شاکر کی ہم عصر شاعرہ کشور ناہید نے کہا کہ

''آج میری بہن مجھ سے بچھڑ گئی ہے انہوں نے کہا کہ جس طرح پروین شاکر گئی ہے۔ جانے والے تو اس طرح نہیں جاتے، پروین میری بہت اچھی دوست تھی وہ میرے سامنے غزلیں لکھتی اور ان پر بحث کرتی، مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ میرے سامنے یہ جو زخمی جسم پڑا ہوا ہے، پروین شاکر کا ہے۔''

انور مسعود نے کہا وہ پورے پاکستان کی واحد شاعرہ تھی جس کی مثال دی جاسکتی ہے۔ آج اس سانحہ پر پاکستان کے قلم قبیلے پر کڑا وقت آن پڑا ہے''۔

پروین شاکر کے عمو جناب احمد ندیم قاسمی نے کہا کہ نہ صرف وہ قلم قبیلے کی آبرو تھی بلکہ اردو شاعری کا حسن بھی۔ انہوں نے کہا میں بدقسمت ہوں کہ آخری وقت میں اپنی بیٹی کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکا۔

ایاز ظہیر کاشمیری نے کہا۔ پروین شاکر سے جدید اردو ادب کا سارا گلستاں مہک رہا ہے۔ وہ پاکستانی قوم کا سرمایۂ افتخار تھی''

ملکۂ ترنم نور جہاں نے کہا، پروین شاکر کی شاعری میں وہ ردھم ہے جو بڑے بڑے شاعروں کی شاعری میں ہوتا تھا۔ اس کی موت سے ہم ایک بہت بڑی شاعرہ سے محروم ہو گئے۔

شبنم شکیل نے کہا کہ پروین شاکر بہت خوبصورت تھی اسے نظر لگ گئی اس نے ہر مرحلے کو شکست دی تھی۔ لیکن موت سے شکست کھا گئی، وہ تو خاموشی کے ساتھ گزر گئی۔ مگر ہمیں ویران کر گئی''

بی. بی سی. کا تبصرہ

پروین شاکر کی موت کے بعد اسی رات بی. بی سی. لندن نے پروین شاکر کی ہی آواز میں اس کا کلام کاسٹ کیا، بی. بی سی. نے ان کی مکمل حیات اور شاعری پر تبصرہ پیش کرتے ہوئے ان کو اردو کی سب سے بڑی شاعرہ قرار دیا اور ان کے منفرد اسلوب پر انہیں اردو ادب کی مہارانی قرار دیا۔

علی سردار جعفری نے جواں مرگ پروین شاکر کی شخصیت اور شاعری پر ایک طویل تہنیت آمیز نوحہ لکھا، جس کا ایک ٹکڑا پیش کیا جا رہا ہے۔

جسم آشنا جسم نظم پیکر
لفظوں کی ہتھیلیاں حنائی
تشبیہوں کی انگلیاں گلابی
سرسبز خیال کا گلستاں

مبہم سے کچھ آنسوؤں کے چشمے

آہوں میں وہ ہلکی سی ہوائیں

صد برگ ہوا میں منتشر تھے

تتلی تھی کہ رقص کر رہی تھی

جناب محفوظ الرحمٰن ہمدم شاہ پوری نے ان کا اوران کی شاعری کا سراپا نذر پروین شاکر کے عنوان سے اس طرح بیان کیا ہے۔

نذر پروین شاکر

عجب بیباک پروین شاعرہ تھی — اور انداز بیاں تھا والہانہ

ہوئی مشہور کم عمری میں زیادہ — چھپا تھا اس کے سینے میں خزانہ

زمانے سے وہ بالکل ماوراء تھی — مگر تھا گھات میں اس کے زمانہ

وہ عورت تھی عزائم پختہ تر تھے — لٹاتی تھی خزانے پہ خزانہ

شکاری تھی پناہیں جانتی تھی — خطا کرتا نہ تھا اس کا نشانہ

زمیں محسوس کرتی تھی وزن کو — وہ عورت تھی کہ تھی علمی خزانہ

لکھا صد برگ، خوشبو، خود کلامی — کفِ آئینہ اس کا ساحرانہ

غزل انکار کی خوشبو سے بہتر — سلاست اور روانی کا خزانہ

غزل سے خوب تر آزاد نظمیں — وہ نظموں میں پرو دیتی تھی دانہ

حلاوت نثر میں غزلوں سے زیادہ — کلامِ نثر گویا معجزانہ

بہت دل چاہتا چیلنج دے دو ستمبر کی دعا کا تازیانہ

ہوئی رخصت بیالیس کی عمر میں اور چھوڑا بے بہا علمی خزانہ

کریں گے لوگ پی۔ایچ۔ڈی۔اسی پر لکھی جائیں گی تھیس عالمانہ

کھلے گا رازِ سربستہ ادب کا

ملے گا فیض ہمدم غائبانہ

پروین شاکر نے بہت پہلے اسلام آباد پر ایک نظم لکھی تھی

ہلکی سرخ پہاڑی پر

دودھیا پھولوں کی چادر

کچھ ایسے بچھی تھی

جیسے پہلی رات کے بعد

دلہن کے آنچل سے جھڑنے والے ستارے

صبح کے سیج پر کھلے ہوئے ہوں

بالآخر پروین شاکر نے اسی سرخ پہاڑوں کے شہر کے چوک پر اپنی ساری رعنائیوں، جلوہ سامانیوں، ذہانتوں اور لطافتوں کے ساتھ دودھیا پھولوں کی چادر اوڑھ کر اسی منظر کا اٹوٹ حصہ بن گئیں۔

باب سوم

مجموعۂ کلام

”خوشبو“

کا تنقیدی جائزہ

پروین شاکر کا پہلا شعری مجموعہ خوشبو، خوشرنگ پھولوں، خوشنما رنگوں، خوش نوا طائروں، میٹھے بول اور دھیمے لہجوں کی شاعری ہے۔ شگفتہ انداز، تروتازگی کے جھونکے نسائی لب ولہجہ، نئے علائم، سادگی، بے ساختگی، روانی، عام فہمی، نزاکتوں، لطافتوں، خیال کی رعنائیوں و برنائیوں، دلکشی و دلکشائیوں، بیان کی رنگینیوں اور مناصب صنعتوں سے آراستہ و پیراستہ تخلیق ہے۔ جس کی اشاعت ۱۹۷۷ء میں ہوئی۔ یہ تین سو ساٹھ صفحات ۲۴۴ نظموں اور ۱۱۸ غزلوں پر مشتمل ہے اور احمد ندیم قاسمی کے نام معنون ہے۔

خوشبو غنچگی، دوشیزگی اور کم سنی کے عہد سے گزرتی ایک لڑکی کے جذبات و احساسات اور نفسیات کی ترجمانی کرتی ہے۔ جس کی عشقیہ شاعری میں سمندر کی گہرائی اور گیرائی ہے۔ وصل کی مٹھاس جذبوں کا لوچ اور جدائی کی کسک ہے گویا اس نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ خاموش جذبوں کو قوت گویائی عطا کی اور نسائی نازک خیالی کو حسین پیکر دیا۔

تانیثیت کے حوالے سے پروین شاکر کا یہ لہجہ پایئہ اسناد تک پہنچ چکا ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع وفکری کینوس بہت وسیع نہیں ہے۔ جذبے کی سچائی اور طرز اظہار کی دلکشی ان کی شاعری کی روح ہے۔ جو محسوس تو کی جاسکتی ہے لیکن دیکھی نہیں جاسکتی جس کے متعلق محمود کاظمی لکھتے ہیں۔

اس شعری مجموعے کی نظموں اور غزلوں کے آئینہ میں ہمیں نہ صرف ایک دوشیزہ کے وہ خواب نظر آتے ہیں جنہیں وہ دیکھتی تو ہے مگر انہیں کوئی نام دینا اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے بلکہ ایک پروقار سمندر جیسی گہری اور ٹھہری ہوئی شخصیت کے خدوخال بھی نظر آتے ہیں۔ وہ نسوانی انا جو پروین شاکر کے شعری مزاج کا ناگزیر حصہ ہے وہ خوشبو کی غزلوں اور نظموں میں بھی دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔" (۴۷)

سراٹھا کر جینے کا جذبہ ہی اس کی شعری شناخت ہے اور انہیں جذبوں کے شعلوں میں افسردگی کی وہ ٹھنڈک بھی پائی جاتی ہے جو اپنی ذات، جذبات، ہستی اور خواہشات کے نہ سمجھے جانے کے اس المیہ کی پیدا کردہ ہے جس نے اس کی شاعری، سیرت وشخصیت کو متاثر کیا۔ خوشبو کے پیش لفظ میں شامل یہ جذبۂ انا ہمیں ان کی پروقار دلکش اور حسین شعری شخصیت سے متعارف کراتا ہے جو نسائی انا کی سربلندی کی بنیاد ہے۔ انداز بیان ملاحظہ ہو۔

''جذبے کا حسن تو اس کی سچائی ہے اور اظہار کی دلکشی اس کا اعتماد ہے سو یہ لڑکی بھی جب آپ سے بات کرے گی تو اس کی پلکیں بیشک بھیگی ہوئی ہونگی۔ لیکن ذرا غور سے دیکھئے اس کا سر اٹھا ہوا ہے۔'' (۴۸)

خوشبو کے حوالے سے ان کی شاعری جن موضوعات کا احاطہ کرتی ہے وہ ہیں معاملات عشق، انتظار، وصل، فراق، تجدید وفا، گھر آنگن، اپنی ذات اور تیری ذات، شبنم بدست لوگ، سیاست اور سماجیت بھی ہے۔ اس مجموعۂ کلام کے متعلق نظیر صدیقی لکھتے ہیں۔

''واقعہ یہ ہے پروین شاکر اردو شاعری میں ایک حیرت انگیز واقعہ ہے ان کی کتاب خوشبو میرے عام اندازے کے مطابق، پندرہ سے پچیس سال کی عمر کے درمیان کی شاعری ہے۔ جو ۲۴۴ ر نظموں اور غزلوں پر عبارت ہے۔ غزلوں اور نظموں میں مساوی طور پر اتنی پرزور اور مؤثر شاعری بڑی مدت کے بعد دیکھنے میں آئی ہے۔ پرگوئی اور خوش گوئی کی ہم سفری کا یہ عالم ہے۔ ۲۵۴ ر صفحے کی کتاب میں کوئی صفحہ ایسا نہیں جو دامن دل کو نہ کھینچتا ہو۔ خوشبو بنیادی طور پر عشق کے جذبات وتجربات کی شاعری ہے اور اردو کے عشقیہ شاعری کے سرمائے میں ایک نہایت منفرد اور خوبصورت اضافہ ہے۔'' (۴۹)

پروین شاکر ایک عہد آفرین شاعرہ ہیں جنھوں نے اپنی نسوانی آواز، چونکا دینے والا اسلوب، نسائی تشبیہات، اور صحرائی اشتہارات سے اردو شاعری میں ہلچل مچادی۔ ان کی شاعری میں صنف نازک کی

HaSnain SIalvi

بے چارگی اور بے بسی کے ساتھ ساتھ احتجاج اور اعتماد کا سلیقہ بھی ہے جس کے متعلق خلیق الزماں نصرت نے لکھا ہے کہ۔

''پروین شاکر کی غزلوں میں نسوانیت کی وہ چیخ چھپی ہوئی ہے جو ایک غیر مطمئن روح سے ابھری ہے جو ایک طرف شاخ گل ہے تو دوسری طرف تلوار بھی ہے۔ انسانی سماج کی ایک عام عورت جو رشتوں میں بندھی ہوئی ہے ایک ایسی شاخ گل جس پر مرجھائے ہوئے باسی پھول ٹنگے ہوئے ہیں۔ ازدواجی زندگی کی ناخوشی اور عدم توازن کے سبب ان غزلوں میں نسوانی جذبات کی حقیقی عکاسی تو ملتی ہے لیکن ایسی عکاسی جو ایک بااختیار صاحب وسیلہ نسائیت کا عکس ہو۔ اس کے عہدے پر فائز ایک ایسی بااختیار تلوار کی جھنکار صاف سنائی دیتی ہے۔ جس میں رزمیے کی نہیں مرثیے کی لے پائی جاتی ہے جنس کی آسودہ تڑپ کا اظہار پایا جاتا ہے۔'' (۵۰)

اس کی شاعری میں حسن وعشق کا رشتہ صرف دو جسموں یا جنسوں تک محدود نہیں بلکہ پوری کائنات اس کے آنچل میں سمٹ آتی ہے جہاں جذبات واحساسات کی ادائیگی میں فضا رنگ ونور میں ڈوبی ہوئی اور فن نجوم و کواکب سے جگمگاتا نظر آتا ہے جہاں محبت کائنات کی ضرورت بن جاتی ہے، جہاں معاملات عشق بھی اور کائنات ہجر بھی، آنسوں سے تر بتر زندگی بھی اور خوشبوؤں وخوشیوں کی لہریں بھی ٹوٹ کر چاہنے اور روٹھ کر بچھڑنے کے واقعات بھی، رومانیت بھی نسوانیت بھی اور انسانیت بھی، خفگی اور ناراضگی بھی لیکن سب کچھ خوشبوؤں کے آنچل اور آنگن میں جہاں زندگی محو پرواز ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

رگ رگ میں اس کا لمس اترتا دکھائی دے
جو کیفیت بھی جسم کو دے انتہائی دے

پروین شاکر نے معاملات عشق میں انتظار اور وصل وفراق کی کیفیت انوکھی تشبیہات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس میں انتظار کی کیفیت کئی رنگوں اور آہنگوں میں ہے۔ جہاں خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ خود سپردگی کا

جذبہ بھی ہے۔ پلکوں پر ستارے روشن ہیں اور گھر کے چراغ گُل ہیں۔ دیدار کی حسرت میں دل کے دریچے نیم وا اور گھر کے دروازے بند تا کہ دستک کی لذت سے بھی لطف اندوز ہوں۔

بارہا تیرا انتظار کیا
اپنے خوابوں میں ایک دلہن کی طرح

ایک اور انداز سپردگی ملاحظہ ہو

رنگ جوئندہ وہ آئے تو سہی
پھول تو پھول ہیں شاخیں اس کی

وصل کی لذت اور فراق کی اذیت کی کیفیت کو بھی انتہائی پر اثر انداز میں بیان کرتی ہیں۔ جہاں وہ محبوب کو جمالیاتی استعاروں، چاند، ستارہ، آفتاب، ماہتاب، شعلہ رو، اور سرخ رو روشن جبیں کہہ کر اسے نمایاں کرتی ہیں۔ جس کی جدائی صرف تکلیف ہی نہیں تاریکی کا بھی باعث ہے اور اس کی موجودگی ایک ایسی روشنی ہے جس میں تمام غم پس پردہ ہو جاتے ہیں۔

شعر ملاحظہ ہوں۔

وہ چاند بن کے میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
میں اس کے ہجر کی راتوں میں کب اکیلی تھی

ہجر کی اذیت کا انداز ملاحظہ ہو

ریل کی سیٹی میں کیسے ہجر کی تمہید تھی
اس کو رخصت کر کے گھر لوٹے تو اندازہ ہوا

چاند، برسات اور خواہشات کا گہرا رشتہ ہے۔ یہ تینوں اگر ہجر میں یکجا ہو جائیں تو رات عذاب بن جاتی

ہے۔شعر ملاحظہ ہوں۔

پورا دکھ اور آدھا چاند

ہجر کی شب اور ایسا چاند

ایک دوسرے شعر میں اسی کیفیت کو اسطرح بیان کرتی ہیں۔

موسم کا عذاب چل رہا ہے

بارش میں گلاب جل رہا ہے

چاند برسات اور خواہشات وصل میں میسر ہو جائیں تو یہ سکون دل ہی نہیں سکون بدن کے بھی باعث ہو جاتے ہیں اور ہجر کی تمام اذیت لذت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہر چیز خوش رنگ، خوشنما اور خوش گوار لگتی ہے۔

وصل میں تیرے خرابے بھی لگیں گھر کی طرح

اور تیرے ہجر میں بستی بھی ویرانہ ہمیں

اور جب وصل میسر ہو تو صرف ایک ہی خواہش رہتی ہے۔

رنگ خوشبو میں اگر حل ہو جائے

وصل کا خواب مکمل ہو جائے

اور وصل کی شب کا اختتام اس کیفیت پر

سوتی رہی آنکھ دن چڑھے تک

دلہن کی طرح تھکن سمیٹے

اور وصل میں بھی جب روح کی تشنگی باقی رہ جائے تو یہ طنزیہ انداز

خوشبو بھی اس کی طرز پزیرائی پر گئی

دھیرے سے میرے ہاتھ کو چھو کر گزر گئی

خوشبو کی شاعری اس عمر کی ترجمانی کرتی ہے۔ جب بنت حوّا اپنی آئندہ زندگی کے لیے حسین خواب بنتی ہیں جو ان کے شریک حیات یا شریک خواہشات کے متعلق ہوتا ہے ان خوابوں کی اہمیت ونوعیت جذباتی اور اہترازی ہوتی ہے جس میں کچا فن پختہ فلسفہ کو مات دیتا ہے۔ اس عمر اور اس قسم کی شاعری میں روٹھنا، منانا، ملنا بچھڑنا، خوش فہمی، بدگمانی بے نام خیالات، الجھے ہوئے سوالات، شب بیداری اور روز خوابی غیر متوازن احوال و افکار کی کثرت پائی جاتی ہے۔ جس میں عشق و جوانی کا جذبہ، جسمانی تجربہ، بننے کی خواہش، انگڑائی لیتی نظر آتی ہے۔ جہاں خود سپردگی میں وہ سکھ ہے، جو خود اعتمادی میں نہیں۔

میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی

چاند، خوشبو، تتلی، جنگل، بھیڑیا، پنکھڑی، بیل وہ استعارے ہیں جو پوری شاعری میں اور خاص کر خوشبو میں کثرت سے ملتے ہیں۔ چاند پروین شاکر کی غزلیہ شاعری کا ایک محبوب ترین استعارہ ہے۔ اس کا استعمال بیشتر جگہوں پر محبوب کے لیے ہوا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ ہجر اور جدائی کی علامت بھی ہے یہ وصل کا راز دار اور ہجر کا غم گسار بھی ہے۔ شریک درد اور راز دار کرب بھی ہے اور غالباً یہ تمام وہی اوصاف ہیں جو محبوب سے وابستہ ہیں۔

چاند بھی میری کروٹوں کا گواہ
میرے بستر کی ہر شکن کی طرح

وہ چاند بن کے میرے جسم میں پگھلتا رہا

لہو میں ہوتی گئی روشنی کی آمیزش

چاند ہی کی طرح خوشبو کا استعارہ بھی کثرت سے استعمال ہوا ہے جو خوشبو، لطافت، نزاکت، جدت، خلوت اور محبوب کی چاہت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جس کا تعلق صرف محسوسات سے ہے۔

عکس خوشبو ہوں بکھرنے سے نہ روکے کوئی

اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی

خوشبو کہیں نہ جائے یہ اصرار ہے بہت

اور یہ بھی آرزو کی ذرا زلف کھولیے

پروین شاکر کی شاعری میں ایک مسلسل تشنگی کا احساس ہے فکر و جذبہ کی کشمکش ہے۔ چاہت اور نفرت دونوں کا سلسلہ ہے۔ یہ اس کی نسائی نفسیات ہے۔ جہاں روح کی تڑپ، درد کی لہر، قربت میں دوری کا اذیت ناک تصور، تنہائی کا خوف اور سب کچھ پالینے سے پہلے ہی کھو دینے کا احساس یہ ایک ایک منفی سوچ ہے۔ جس نے خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لی ہے۔

دل اسے چاہتا ہے جسے عقل نہیں چاہتی ہے

خانہ جنگی ہے عجب ذہن و بدن میں اب کے

غزل پروین کی شاعری کی تلخیص اور نظم تفسیر ہے۔

خوشبو میں نظموں کی تعداد زیادہ ہے جس میں سکھ کے موسم کا دکھ اور نیا دکھ کے علاوہ بھی نظمیں آزاد ہیں جو مختصر بھی ہیں اور طویل بھی ہیں اور مختصر وطویل مصروں پر مشتمل بھی ہیں۔ انہیں نظموں کے ذریعہ انہوں نے زندگی کی کہانی آپ بیتی اور جگ بیتی کو دلکش اور دل نشین انداز میں پیش کیا ہے۔ علامت اور استعاروں کے رنگ نے ان کے فن میں جدت عطا کی۔ جہاں فطری عناصر اور فانی لوازمات یکساں نظر آتے ہیں جو خالق شعر کی پسند اور تخلیق شعر کی بنیاد بنتے ہیں۔ جن میں ہوا، سمندر، موجیں، جنگل، وادی، رنگ، خوشبو، موسم، چاند اور پرند استعارے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جب کہ پنکھڑی، تتلی، چڑیا، مور، کے ذریعہ نسائی کردار کی تخلیق ہوتی ہے اور نسائی تمثیلوں میں دلہن، حیا، سیج، چوڑیاں، بندیا، پازیب، اور بستر کی شکن کا استعمال خوشبو سے کف آئینہ تک ملتا ہے۔ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت الفاظ کی سادگی اور پرکاری ہے۔ جس کے متعلق ڈاکٹر آفتاب احمد لکھتے ہیں۔

''پروین شاکر کی شاعری کی ایک پہچان ان کے زبان کی سادگی و پروکاری ہے ان کے یہاں الفاظ وتراکیب کے انتخاب واستعمال میں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور احساسِ حسن پایا جاتا ہے ان کی لغت میں بول چال کی زبان کا محاورہ اور روز مرہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ہاں ان میں کچھ ہندی اور فارسی کی پٹ بھی ہے جسے وہ حسب ضرورت کام میں لاتی ہیں۔'' (۵۱)

پروین شاکر نے اپنے شعری موضوعات خواہ وہ حسن وعشق کے ہوں، نفسیاتی ہوں، فکری ہوں، مذہبی ہوں یا جمالیاتی ہوں، نسوانیت کو ہمیشہ بیدار رکھا جدید حسّیت کی وہ صاحب طرز شاعرہ تھیں۔ اور اس کی شاعری میں نسائی دکھ، مظلومیت اور عظمت کا فنکارانہ اظہار ملتا ہے۔ جہاں تازہ کاری اور دیدہ وری کے تیکھے، لہلہاتے اور معطر اسلوب نے صرف شعراء وشاعرات کو ہی نہیں مبصرین و ناقدین کو بھی چونکا کے رکھ دیا۔ نئے لب ولہجہ

نے جہاں نغمگی، غنائیتِ اور ترنم کے ذریعہ تفکر و سنجیدگی پیدا کی وہیں تنوع، جدت بیان، عصری حسیت، الفاظ کا حسن وانتخاب، داخلی نغمگی نے مروت اور دردمندی کے جذبات کی غمازی کی۔ ان کی یہ استادی جرأت و بیبا کی ثابت کرتی ہیں کہ زبان و بیان پر انہیں بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ جب ان کا قلم سیاست کے باب میں داخل ہوتا ہے تو اس میں طنز، کڑواہٹ اور تلخی دیکھی جاتی ہے۔ جب نسوانیت کا روپ دھارتا ہے تو جذبے کومل اور لہجہ موم سے زیادہ نرم ہوجاتا کیونکہ وہ عصر حاضر کے حالات سے خوب واقف تھیں۔ خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر بلا کا مشاہدہ رکھتی تھیں ان کی ان خصوصیات کا ذکر رحیم طلب ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''پروین کلاسیکیت و جدید حسیت کے ساتھ ساتھ روایات حسن وعشق کی پاسبان تھی وہ جہاں سوز و ساز کی آواز ہی نہیں تھی مہر بلب خواتین، بے زبان خواتین کی زبان بھی تھی، وہ دکھی سماج کے درد کا درماں ہی نہیں بلکہ عصری سماج سوز پر ماتم کناں بھی۔ تڑپتی اور سسکتی انسانیت کی آہ وفغاں بھی تھی اور وہ اپنی ذات میں تجربات ومشاہدات اور سیاسی تصورات اور تمدنی نظریات لطیف و کومل جذبوں سے مزین انجمن بھی تھی۔'' (۵۲)

خوشبو کی نظمیہ شاعری میں بھی غزلوں کی طرح ایک نوسنِ دہلیز بلوغت پر قدم رکھتی معصوم زندگی کے جذبات واحساسات کا اظہار ہے۔ جہاں جذبۂ عشق ہی اساس زندگی ہے ان نظموں میں ابتدائی مراحل محبت اور چاہت کے نشیب وفراز خواہشات کے طوفان، خود اعتمادی کا مزہ اور خودسپردگی کا لطف، عشق کی بے باکی اور محبت کی بے بسی، امید نان اور بیم جان، دل سے قرار، زبان سے انکار، ماضی کی مسرت، حال کی اذیت اور مستقبل کی وحشت، پیار کا لہجہ، طنز کے بول، ناکامی کا خوف، کامیابی کی امید، ناکامیوں کے بعد بھی امید کا چراغ، یہی وہ کیفیت ہے جو ان کی نظموں کا موضوع ہے اور اس پہلے شعری مجموعہ میں پہلا پیار ہی غالب ہے۔ مختلف رنگوں اور آہنگوں میں نظم کشف کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

ہونٹ بے بات ہنسے

زلف بے وجہ کھلے

خواب دکھلا کے مجھے

نید کس سمت چلی

خوشبو لہرائی میرے کان میں سرگوشی کی

اپنی شرمیلی ہنسی میں نے سنی

اور پھر جان گئی

میری آنکھوں میں تیرے نام کا تارہ چمکا

پروین شاکر کی شاعری کا یہ جذبہ اپنی خواہش کی تکمیل چاہتا ہے۔ جس کو وہ کوئی بھی نام دینے سے قاصر ہے۔ لیکن جب یہ کشف کرامات کی شکل اختیار نہیں کرتا خواب کی تعبیر اور جذبوں کی تکمیل نہیں ہوتی تو یہ کشف صاف گوئی اور دیدہ وری سے اعتراف میں تبدیل ہو جاتا ہے اور نظم اعتراف کا نزول ہوتا ہے۔

جانے کب تک تیری تصویر نگاہوں میں رہی

ہو گئی رات تیرے عکس کو تکتے تکتے

میں نے پھر تیرے تصور کے کسی لمحے میں

تیری تصویر پر لب رکھ دیے آہستہ سے

لیکن تصورات، خیالات، خواہشات اور خواب وخیال کی دنیا کا حقیقی دنیا سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ یک طرفہ چاہت محبت نہیں حماقت ہوتی جو بے شمار پریشانیاں کھڑی کر دیتی ہے۔ جس کا حل صرف ماضی کی وادی میں خودکشی وخودگریزی کے آنچل میں ملتا ہے۔ جس سے انسان مردہ نہیں تو پژمردہ ضرور ہو جاتا ہے

جس سے دل ودماغ قائل بہ سراب اور مائل بہ اضطراب ہوتا ہے۔ جب کہ فنکار اپنے فن کے ذریعہ انہیں ان ماویٰ وملجا سے نکال کر میدان عمل میں لانے کی کوشش کرتا ہے اور ماضی کی حسین یادوں کے وسیلے سے انہیں مستقبل کے لیے تیار کرتا ہے اسی کیفیت کو پروین شاکر نے اپنی نظموں میں ساحل، سمندر، ریت کا ایک سلسلہ پیدا کرتی چلی جاتی ہیں۔

ان کی نظمیں مشورہ، پکنک، آنچل اور بادبان، جان پہچان، احساس، دل کی ہنسی، دوست، سمندر کی بیٹی، بے نسب ورثے کا بوجھ، ایسی ہی شعری تخلیقات میں جس میں ساحل کے کنارے ایک لڑکی کو اپنے عہد گزشتہ کی یادوں میں کھویا ہوا دکھایا گیا ہے۔ وہ جب سمندر کا مشاہدہ کرتی ہے تو اس کو گزرا زمانہ یاد آتا ہے۔ جب وہ محبوب کے ساتھ سمندر کی لہروں سے کھیلا کرتی تھی۔

گیلی ریت پر قدموں کے نشان چھوڑ دیا کرتی تھی لیکن اب وہ چیزیں صرف یادوں کے ایک گوشہ میں محدود و محفوظ ہیں اور جب کبھی وہی منظر و کیفیت اکیلے میں دیکھتی ہے تو اپنے ساتھی کا شدید احساس ہوتا ہے اور یہ احساس لفظوں کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے۔ کیونکہ یہ کئی اور لڑکی نہیں بلکہ خود پروین شاکر کی ہی کہانی ہے۔ نظم جان پہچان کا یہ ٹکڑا دیکھیے۔

شور مچاتی موج آب
ساحل سے ٹکرا کر جب واپس لوٹی تو
پاؤں کے نیچے جمی ہوئی چمکیلی سنہری ریت
اچانک سرک گئی
کچھ کچھ گہرے پانی میں
کھڑی ہوئی لڑکی نے سوچا
یہ لمحہ کتنا جانا پہچانا لگتا ہے

پروین شاکر کی شعری کائنات میں شکستِ ذات کا عمل نمایاں طور پر محسوس کیا جاتا ہے ایک کشمکش ہے ایک اختلاج ہے جہاں ماضی کبھی جائے پناہ بنتا ہے تو کبھی عذاب جاں اور یہی کیفیت محبوب کی بھی۔
کبھی اس کی قربت جسم و جاں کو آسودہ کرتی ہے تو کبھی وجود ہی کو ختم کر دیتی ہے یہی تشنگی اور احساس شکستگی تمام نظموں میں پائی جاتی ہے۔ جہاں وصل پر ہجر اور خوشی پر محرومی کا غلبہ ہے اس کی نظم ''آج کی شب تو کسی طور گزر جائے گی'' اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ اس کو محبوب کا قرب حاصل ہونے کے باوجود آنے والے کل کی جدائی کا غم کھائے جا رہا ہے۔ گہری رات میں چمکتا ہوا چاند، ماتھے پر دمکتا ہوا محبوب کا پیار، سانسوں میں مہکتے ہوئے لمس کی خوشبو، سینے میں اپنے محبوب کی طرف سے بے رخی کا اندیشہ اور بے وفائی کا رویہ ہمیشہ بے چین کیے رہتا ہے۔ نظم کا ایک شعر پیش ہے۔

آج کی شب تو بہت کچھ ہے مگر کل کے لیے
ایک اندیشہ بے نام ہے اور کچھ بھی نہیں

انگڑائیاں لیتی خواہشات کسی فرد واحد سے نہیں بلکہ موسم سے دعا گو ہے تا کہ صرف اس کی تنہائی ہی نہیں بلکہ درد و جدائی میں مبتلا سبھی جسموں کو آرام میسر ہو اور خواہشات پائے تکمیل کو پہنچے۔
نظم موسم کی دعا کا یہ انداز دیکھیے۔

پھر ڈسنے لگی ہیں سانپ راتیں
برساتی ہیں آگ پھر ہوائیں
پھیلا دے کسی شکستہ تن پر
بادل کی طرح اپنی باہیں

آرزوؤں کی باہوں میں گرفتار ہو کر گیلی ریت پر گھومنا خواہشات کی تلاش میں محو رہنا حسرت سے آنچل کو

مسلنا، بیکل آنکھوں سے لہروں کو تکنا بے چینی، بیقراری، اور اکیلے پن کا پر درد اور پر اثر اظہار ہے۔ نظم آنچل اور بادبان دیکھیے۔

ساحل پر ایک تنہا لڑکی
سرد ہوا کے بازو تھامے
گیلی ریت پہ گھوم رہی ہے
جانے کس کو ڈھونڈ رہی ہے
بن کاجل بے کل آنکھوں سے
کھلے سمندر کے سینے پر
فراٹے بھرتے کشتی کے بادبان کے لہرانے کو
کس حیرت سے دیکھ رہی ہے

پروین شاکر کی شاعری میں تنہائی کا احساس جو بار بار ملتا ہے نہ وہ جدید زندگی کا جبر ہے اور نہ ہی طرز راہ فرار بلکہ یہ رشتوں رابطوں اور نزدیکیوں کی ضرورت کے احساس کا آئینہ دار ہے۔ نظم چاند میں یہی کیفیت مسافر، مقدر اور تنہائی کی ترجمان ہے۔

ایک سے مسافر ہیں
ایک سا مقدر ہے
میں زمین پر تنہا
اور وہ آسمانوں میں

وصل کا خواب تنہائی کی اذیت موسم کا عذاب، بیبسی، مجبوری، اور گدگدی کے الفاظ پر مشتمل ان کی نظمیں

تنہائی کے درد اور روح کی پیاس کو دھیمے اور میٹھے لہجے میں بیان کرتی ہیں صرف ایک لڑکی میں یہی جذبۂ تشویق بار بار ابھرتا ہے۔

اپنے سرد کمرے میں
میں اداس بیٹھی ہوں
نیم وا دریچوں سے
نم ہوائیں آتی ہیں
میرے جسم کو چھو کر
آگ سی لگاتی ہیں
تیرا نام لے لے کر
مجھ کو گدگداتی ہیں

بارش، بدن اور بسنت کے تعلق سے پروین شاکر کی نظمیں بیدار خواہشات، اور تشنگی جسم و جان کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔

جہاں قدرت نے زمین کے مردہ بدن کو بھی اس سے سیراب کیا اور وہ ہری بھری ہو اٹھی لیکن نوعمر خواہشات ابھی صرف تماشائی ہیں جس سے ہجر کی کیفیت مزید پر درد ہو جاتی ہے۔ نظم بارش میں دیکھیے ۔

زمین ہے
یا کہ کچی رنگوں کی ساری پہنے
گھنے درخت کے نیچے کوئی شریر لڑکی
کوئی شریر تر پانیوں سے اپنا بدن چرائے چرا نہ پائے

یہی کیفیت مزید شدت کے ساتھ نظم بے بسی میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بارش نے زمین پر پاؤں دھرا

خوشبو کھنکی گھونگھرو جھنکا

لہرائی ہوا بہکی برکھا

کیا جانیے کیا مٹی نے کہا

درآئی شریر میں ایک ندیا

کس اور چلی دیا دیّا

کس گھاٹ لگوں رے پرویّا

سارا جگ جل اور میں تپّا

جل کی کثرت نے جگ کو تو سیراب کردیا لیکن بدن کی خواہشات کو تشنہ ہی چھوڑ گیا، جب کہ گھنگھرو، خوشبو، برکھا اور پرویّا نے اسے بے چین کررکھا ہے وہ کسی ایسے ساحل کی متلاشی ہے جو اس کی زندگی اور جوانی کی نیا کو سکون و تحفظ دے سکے وہ ان چاہتوں کے سمندر میں مسلسل تیرتے تیرتے، بے بس اور مجبور ہو چکی ہے۔

نظم بسنت بہار کی نرم ہنسی میں یہی کیفیت شوخی، گدگداہٹ، چھیڑ چھاڑ، زلف کھلنے، تن چھلکنے اور بدن بھیگنے کے ساتھ جاگ اٹھتی ہے۔نظم اس طرح ہے۔

بسنت بہار کی نرم ہنسی

آنگن میں جھلکی

بھیگ گئی میری ساری

پھر پروا کی شوخی

کیسے اپنا آپ سنبھالوں

آنچل سے تن ڈھاپوں تو

زلفیں کھل جائیں

زلف سمیٹوں

تن چھلکے گا

پروین شاکر کی عشقیہ شاعری ہو یا سیاسی وسماجی شاعری ہو اس میں نسائی، بے بسی، مجبوری، بے ثباتی اور بے اعتباری کے ساتھ ساتھ اس کی انا کی سربلندی، کا جذبہ ضرور شامل ہے۔ جس کا انداز بیاں تلخ نہیں بلکہ دلکش اور دلپزیر ہے ان کی نظموں میں دوست، چڑیا کے لیے کچھ حرف سمندر کی بیٹی، خواب، صرف ایک لڑکی، بنفشے کا پھول، ناٹک، فلاور شو، واٹرلو جیسی بہت سی نظمیں ہیں۔ جن کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ نظم ''دوست چڑیوں کے لیے کچھ حرف'' کے کچھ حرف ملاحظہ ہوں۔

چڑیا پیاری

میرے روشن دان سے اپنے تنکے لے جا

ایسا نہ ہو کہ

میرے گھر کی ویرانی کل

تیرے گھر کی آبادی کو کھا جائے

تجھ پر میری مانگ کا سایہ پڑ جائے

نظم خواب بھی اس کیفیت کی غماز ہے جس میں خواب وخیال کی تمام خواہشات دست بستہ کھڑی ہیں اور خوش نما مستقبل کی بنیادیں ریت پر رکھی جاتی ہیں۔ جس میں نہ ثبات ہے اور نہ ٹھراؤ لیکن خواب دیکھنے اور

خوابوں کے محل تعمیر کرنا نسائی فطرت ہے جو اسے پوری زندگی پایہ تکمیل رکھتی ہے۔

کھلے پانیوں میں کھڑی لڑکیاں

نرم لہروں کے چھینٹے اڑاتی ہوئی

بات بے بات ہنستی ہوئی

اپنے خوابوں کے شہزادوں کا تزکرہ کر رہی تھیں

جو خاموش تھی

ان کی آنکھوں میں بھی مسکراہٹ کی تحریر تھی

ان کے ہونٹوں کو بھی ان کہے خواب کا ذائقہ چومتا تھا

آنے والے نئے موسموں کے سبھی پیرہن نیلمیں ہو چکے تھے

دور ساحل پہ بیٹھی ہوئی ایک ننھی سی بچی

ہماری ہنسی اور موجوں کے آہنگ سے بے خبر

ریت سے ایک ننھا گھروندا بنانے میں مصروف تھی

اور میں سوچتی تھی

خدایا یہ ہم لڑکیاں

کچی عمروں سے ہی خواب کیوں دیکھنا چاہتی ہیں

خواب کی حکمرانی میں کتنا تسلسل رہا ہے

عورت ہمارے معاشرے میں ہمیشہ مجبور محکوم اور محصور رہی ہے اسے آزادی اور سرفرازی کبھی بھی حاصل نہیں ہوئی۔ وہ چھوٹی رہتی ہے تو باپ کے ہاتھوں مجبور، بڑی ہوتی ہے تو شوہر کے ہاتھوں محکوم اور بوڑھی ہوتی

ہےتو اولاد کے ہاتھوں محصور ہوتی ہے اورنسوانی آزادی کی تمام تحریکات صرف اس لیے کہ انہیں چڑھایا جائے اور تفریح کا سامان بنادیا جائے۔

ان کی نظم ''ناٹک'' بھی ایسے ہی محسوسات کا شعری پیکر ہے جوخواتین کے عالمی دن پر بہترین طنز ہے جس میں عورتوں کے فلاح، بہبود، اور آزادی وترقی کا ایک منصوبہ تیار کیا جاتا ہے۔ جوصرف ظاہری ہوتا ہے اور حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، یہ صرف انہیں استعمال کرنے کا ہتھکنڈہ ہے۔جس کے ذریعہ ان کا مزید استحصال کیا جاسکتا ہے۔نظم ''ناٹک'' اسی ناٹک کی گواہی دیتی ہے۔

رت بدلی تو بھنوروں نے تتلی سے کہا

آج سے تم آزاد ہو

پروازوں کی ساری سمتیں تمہارے نام ہوئیں

جاؤ

جنگل کی مفرور ہوا کے ساتھ اڑو

بادل کے ہمراہ ستارے چھوآؤ

خوشبو کے بازو تھامو اور رقص کرو

رقص کرو

کہ اس موسم کے سورج کی کرنوں کا تاج تمہارے سر ہے

لہراؤ

کہ ان راتوں کا چاند تمہاری پیشانی پر اپنے ہاتھ سے دعا لکھے گا

گاؤ

ان لمحوں کی ہوائیں تم کو تمہارے گیتوں پر سنگت دیں گی
پتے کڑے بجائیں گے
اور پھولوں کے ہاتھوں میں دف ہوگا
تتلی معصومانہ حیرت سے سرشار
سیہ شاخوں کے حلقے سے نکلی
صدیوں کے جکڑے ہوئے ریشم پر پھیلائے اور اڑنے لگی
کھلی فضا کا ذائقہ چکھا
نرم ہوا کا گیت سنا
ان دیکھے کہساروں کی قامت ناپی
روشنیوں کا لمس پیا
خوشبو کے ہر رنگ کو چھو کر دیکھا
لیکن رنگ ہوا اور خوشبو کا وجدان ادھورا تھا
کہ رقص کا موسم ٹھہر گیا
رت بدلی
اور سورج کی کرنوں کا تاج پگھلنے لگا
چاند کے ہاتھ دعا کے حرف ہی بھول گئے
ہوا کے لب برفیلے سموں میں نیلے پڑ کر اپنی صدائیں کھو بیٹھے
پتوں کی باہوں کے سر بے رنگ ہوئے

وہ تنہا رہ گئے پھول کے ہاتھ

برف کی لہر کے ہاتھوں تتلی کو لوٹ آنے کا پیغام گیا

بھنورے شبنم کی زنجیریں لے کر دوڑے

اور بے چین لہروں میں ان چکھی پروازوں کی آشفتہ پیاس ملا دی

اپنے کالے ناخونوں سے

تتلی کے پر نوچ کے بولے

احمق لڑکی گھر واپس آ جاؤ ناٹک ختم ہوا

پروین شاکر شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حساس عورت بھی تھیں جو تجربات کی کئی منزلوں سے گزر چکی تھیں اسی لیے ان کے یہاں ازدواجی الجھنوں کا کھل کر اظہار ملتا ہے۔ شریک حیات کے ساتھ بھی تنہائی کا خوف اور تشنگی کا احساس صرف ان کی اپنی زندگی کا بیان نہیں بلکہ تمام نسوانیت کی داستان ہے۔ جس میں نوخیز لڑکی کی پہلی محبت کی جھلک معاملات عشق میں سہا سہا اور دبے دبے انداز کے ساتھ ساتھ دل کی دھڑکنوں وصل کی لذتوں کے ارتعاش میں وہ ساری باتیں کہہ بھی جاتی ہیں جو بازوؤں کے حلقے میں نازک بند، ملبوس کی سلوٹیں، ڈھلکا ہوا آنچل، گرمئ رخسار، سرخ ہونٹوں پہ شرارت کے لمحے کا عکس کو الفاظ کا جامہ دے دیا اور اپنی نظم ایکسیٹی میں اس کا اظہار اسی طرح کر بیٹھی۔

سبز مدھم روشنی میں سرخ آنچل کی دھنک

سرد کمرے میں مچلتی گرم سانسوں لی مہک

بازوؤں کے سخت حلقے میں کوئی نازک بدن

سلوٹیں ملبوس پر آنچل بھی کچھ ڈھلکا ہوا

گرمئ رخسار سے دہکی ہوئی ٹھنڈی ہوا

نرم زلفوں سے ملائم انگلیوں کی چھیڑ چھاڑ

سرخ ہونٹوں پر شرارت کے کسی لمحے کا عکس
ریشمیں بانہوں میں چوڑی کی کبھی مدھم کھنک
شرمگیں لہجوں میں دھیرے سے کبھی چاہت کی بات
دو دلوں کی دھڑکنوں میں گونجتی تھی ایک صدا
کانپتے ہونٹوں پہ تھی اللہ سے صرف اک دعا
کاش یہ لمحے ٹھہر جائیں ٹھہر جائیں ذرا

ریا کاری، مکاری، ظاہر داری، پر بھی ان کے اشعار میں طنز ملتا ہے۔ جہاں وہ مختصر الفاظ میں بہت بڑی بات کہہ جاتی ہیں۔ جس کی تفسیر پر قاری سر دھنتے ہیں۔ ایک ایسی ہی مختصر ترین نظم ''مقدر'' ہے۔ جس میں وہ کہتی ہیں۔

میں وہ لڑکی ہوں
جس کو پہلی رات
کوئی گھونگھٹ اٹھا کے کہہ دے
میرا سب کچھ تیرا ہے دل کے سوا

پروین شاکر نے اپنی شاعری میں نسوانیت کے ہر پہلو کو اجاگر کیا، جہاں عورت ماں بھی ہے، بہن بھی ہے، محبوبہ بھی ہے، بیوی بھی ہے، طوائف بھی ہے اور نند بھی ہے لیکن ہر کردار میں مجبور و محصور۔ پروین شاکر نے ہر ایک کردار کا سراپا پیش کیا۔ جس میں نند کے مقدس سراپا کو ان الفاظ میں پیش کرتی ہیں۔

وہ میری ہم سبق
زمین پر جو ایک آسمانی روح کی طرح سفر میں ہے
سفید پیرہن گلے میں نقرئی صلیب
ہونٹ، مستقل دعا

باب چہارم

مجموعۂ کلام "صدبرگ" کا تنقیدی جائزہ

صد برگ پروین شاکر کا دوسرا شعری مجموعہ ہے،خوشبو کے بعد ۱۹۸۰ء میں اشاعت پزیر ہوا اور ہندوپاک میں مشہور ومقبول ہوا۔خوشبو کی جدت یہاں شدت اختیار کر گئی ہے۔ کیونکہ یہاں وہ ایک نا آشنا دوشیزہ نہیں بلکہ جہاں دیدہ عورت بن کر اپنی بات رکھتی ہیں۔ پروین کی شاعری چونکہ ان کی سرگزشت ہے، آپ بیتی ہے، آبلہ پائی ہے۔اس لیے جیسے جیسے ان میں یا ان کے حالات میں تبدیلی ہوتی ہے ان کی شاعری بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔خوشبو کی لڑکی جہاں گریز پالمحوں کی ٹوٹی ہوئی دہلیز پر کھڑی ہوئی کسی سوچ میں گم نظر آتی ہے کہ وہ کیا ہے۔ کیوں کہ اس کے اندر کی لڑکی ابھی تک منکشف نہیں ہوئی۔ وہیں صد برگ تک آتے آتے سارے منظر نامے یک لخت تبدیل ہو جاتے ہیں۔اس سلسلے میں وہ خود کہتی ہیں۔

''صد برگ تک آتے آتے منظر نامہ بدل چکا تھا۔میری زندگی کا بھی اور اس سرزمین کا بھی، جس کے ہونے سے میرا ہونا ہے، رزم گاہِ جاں میں ہم نے کئی معرکے ایک ساتھ ہارے اور بہت سے خوابوں پر اکٹھے، مٹی برابر کی شامِ غریباں کی پینٹنگ کیسے بنے گی، کوفہ شہر کے منارے سبز تو نہیں ہوسکتے۔سچائی جب مخبروں میں گھر جائے تو گفتگو علامتوں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔'' (۵۳)

جب کوفہ شہر کے منارے سبز نہیں ہوسکتے تو صد برگ میں خوشبو کی چاشنی بھی نہیں مل سکتی کیوں کہ وہاں خوابوں کی دنیا تھی یہاں حقیقت کی آزمائشیں ہیں۔وہاں خوش فہمی تھی یہاں تلخ حقیقت، وہاں پزیرائی تھی یہاں شمشیر بکف، وہاں خوشنماں پھول تھے تو یہاں خورو خار، وہاں زندگی قائل بہ محبت تھی تو یہاں مائل بہ مصیبت، وہاں دھیمہ لہجہ تھا تو یہاں سخت بول، وہاں زلف بے وجہ کھلتی تھی تو یہاں سوگ میں بال کھولے جاتے ہیں۔یعنی زندگی یکسر تبدیل ہوئی تو الفاظ نے بھی پیرہن بدلا اور حالات نے بھی کروٹ بدلا۔

صد برگ کی ترتیب واشاعت کے وقت تک پروین شاکر کی زندگی نیا موڑ لے چکی تھی وہ اپنے اندر حالات سے لڑنے کی ہمت پیدا کر رہی تھی۔کبھی حالات کو بدلنے کی کوشش کرتی تھی، کبھی اپنے آپ کو۔ یہ دونوں

کام اس کے لیے بہت مشکل تھا۔'' (۵۴)

صد برگ میں علامتی گفتگو ہی ان کی شاعری کا خاص استعارہ ہے جو سماج کے المیہ کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور اس کے وجود کے خلا کو پیش بھی کرتا ہے جس سے اسے اور اس کی شاعری دونوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی حقیقت پسندی اور انا کی سربلندی ہی ان کے وجود اور شاعری کے لیے باعث عتاب ثابت ہوئی۔ جس کے سلسلے میں وہ خود رقمطراز ہیں۔

جس معاشرے میں قدروں کے نمبر منسوب ہو چکے ہوں اور درہم خوداری، دینار عزت نفس کوڑیوں کے بھی مول نہ نکلیں، بصارتیں اندھی ہو جاتی ہیں اور میرا گناہ یہ ہے کہ میں ایسے قبیلے میں پیدا ہوئی جہاں سوچ رکھنا جرائم میں شامل ہے۔ لیکن میرے قبیلہ والوں سے یہ بھول ہوئی کہ انہوں نے مجھے پیدا ہوتے ہی زمین میں نہیں گاڑا اور اب مجھے دیوار میں چن دینا ان کے لیے اخلاقی طور پر اتنا آسان نہیں رہا۔'' (۵۵)

مخبروں میں گھر جانے کے بعد گفتگو جب علامتوں کے سپرد ہوگئی تو شعری ساخت اور ہیئت میں بھی تبدیل آئی۔ نئی معنویت اور نئی لفظیات نے نئی فضا پیدا کی اور یہی فضا آگے چل کر صد برگ کی پہچان بنتی ہے۔ جہاں پر لفظ اور جملے پر معنی ہیں اسی شعری انفرادیت کے خط وخال میں اس کی علامات بطور خاص رنگ، خوشبو، روشنی اور ہوا نمایاں طور پر سامنے آتی ہے۔ چونکہ یہ علامتیں ذاتی اور شخصی نہیں ہیں اس لیے ذہن ان کی معنویت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ تبدیلی ہے جسے آپ پروین شاکر کے فن کا ارتقاء بھی کہہ سکتے ہیں اور فن کا زوال بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ آپ کے فہم وادراک پر منحصر ہے۔ معین الدین عقیل نے اس مجموعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ!

''پروین شاکر نے اپنے پہلے شعری مجموعے میں جن صلاحیتوں کا اظہار کیا تھا وہ ان کے دوسرے شعری مجموعے صد برگ میں اس سطح پر نظر نہیں آتیں، خیالات و جذبات میں تازگی اور نکھار تو ہے لیکن اب اس میں

ندرت اور دلکشی کی کیفیت کم ہے بلکہ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو خوشبو کے مقابلے ان کی شاعری صد برگ میں زوال پزیر ہوئی ہے۔''(۵۶)

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ انہیں ندرت اور دلکشی کیوں کم نظر آئی۔ ایسا نہیں کہ پروین کو الفاظ پر قدرت نہیں یا تمام صلاحیتیں خوشبو میں ہی صرف ہو گئیں اور ان کا فن خالی ہو گیا بلکہ حالات کے ساتھ ساتھ الفاظ بھی تبدیل ہوئے اور خوشنمائی نے حقیقت کا رنگ اختیار کیا جب کہ خوشبو میں تمام معاملے بھرم اور نا آشنائی کا ہے اور صد برگ حقیقت اور جہاں دیدہ فن کی پختگی کا شاہکار ہے آپ اگر مرثیے میں رخسار اور گلاب تلاش کریں تو یہ زوال فن کا نہیں ذہن کا ہے۔ اس لیے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صد برگ پروین شاکر کے فن کا ارتقاء ہے۔ جس کے متعلق عبدالاحد ساز لکھتے ہیں۔

''پروین شاکر کے پہلے شعری مجموعے خوشبو میں ہمیں غنچگی کے عہد سے گزرتی ہوئی ایک Teenagar لڑکی ملتی ہے۔

یہ کتاب اس لڑکی کے ذوق جمال، جذبۂ الفت، نیاز مندی، محبوبانہ خوابوں کے کچے رنگوں امیدوں، دلشکنیوں اور یقین وشکوک کے گھلے ملے آب ورنگ سے مزین ہے۔ ان کمسن نفسیات کی ترجمانی اتنی شگفتگی، اتنی شوخی، اتنی شائستگی کے ساتھ اردو شاعری میں پہلی بار پروین شاکر کے یہاں ہی ملتی ہے۔ پھر دوسرے مجموعے صد برگ میں یہ لڑکی سے عورت بنتی ہوئی شادابی کے دور سے گزرتی ہوئی نسوانیت کا اظہار بڑے جرأت مند مگر بڑے ہی پروقار اور خود اعتماد لہجے میں ملتا ہے۔ صد برگ کی نظموں اور غزلوں میں عشق کا تجربہ راست اور اکہرا ہونے کے بجائے بلیغ اور تہدار ہو جاتا ہے اور ان میں عصری حیثیت، سماجی وسیاسی شعور اور فکر و فلسفے کے شیڈس نظر آنے لگتے ہیں۔ جو بعد کی تصنیفات یعنی خود کلامی اور انکار میں اور بھی زیادہ گہرے ہو گئے ہیں۔''(۵۷)

صد برگ کی غزلیات کے شعری کردار میں جو عاشق کا روپ ہے وہ اختلافات اور تضادات کا مجموعہ ہے۔ کبھی ایک دوسرے پر فدا تو کبھی ایک دوسرے سے خفا، کبھی عقیدت تو کبھی نفرت، کبھی قربانی کا جذبہ تو کبھی خودگریزی کا جذبہ تو کبھی وصال ہی منزل مقصود تو کبھی ہجر ہی منزل مستقل ایک دوسرے کے لیے رواز ے بند بھی اور تجدید وفا کی خواہش بھی، ملنے کی تمنا بھی اور ملنے سے گریزاں بھی، متضاد کیفیتوں کی کشمکش ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ بیک وقت مختلف کیفیات کی عکاسی اور عمل وردعمل کے معنی نتائج زندگی کو بھی معنویت کے مقام پر لا کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ خوددار شخصیت اور خوداعتمادی کی حسیت ہے۔ جو کسی بھی مقام پر سمجھوتا نہیں ہونے دیتی ہے۔ جہاں خواہشات پر خودداری کی فوقیت ہے لیکن خواہشات کی تشنگی بھی بار بار سر اٹھاتی ہے اور سیراب ہونا چاہتی ہے۔ ایک جگہ خوداعتمادی یہ کہلواتی ہے کہ

کچھ تو تیرے موسم ہی مجھے راس کم آئے
اور کچھ میری مٹی میں بغاوت بھی بہت تھی

تو روح کی تشنگی یہ بھی کہلواتی ہے۔

دریچے میں نے بھی وا کر لیے ہیں
کہیں وہ ماہتاب آنے کو ہے پھر

پروین شاکر کی شاعری میں جب محبوب سے عقیدت بڑھتی ہے تو اسے فرشتہ بنا دیتی ہے اور جب اس میں کمی آتی ہے تو ایک قدم بھی ساتھ چلنا گوارہ نہیں ہوتا اور جلد سے جلد ہاتھ چھڑانے کی کوشش ہوتی ہے ایک طرف یہ عقیدت کہ

اس کی ثنا میں حد بیاں سے نکل چکا
دل کا یہ حال ہے تو یہاں سے نکل چکا

تو دوسری طرف یہ شکایت بھی کہ

جب تک وہ بے نشان رہا دسترس میں تھا

خوش نام ہو گیا تو ہمارا نہیں رہا

ان کے یہاں رشتوں کے بننے اور بگڑنے کا ایک لامتناہی سلسلہ ملتا ہے جہاں تجدید محبت کا رجحان بار بار سامنے آتا ہے۔ ترک تعلق کی نوعیت ضرور آتی ہے لیکن ترک تعریف نہیں اور رشتوں کی از سر نو بازیافت اپنے دامن میں درد و کسک لیے ماضی کی طرف مڑتی ہے اور یہ تلخی و تمناؤں کا سلسلہ بنتا و بگڑتا رہتا ہے۔

ریت ابھی پچھلے مکانوں کی نہ واپس آئی

پھر لب ساحل گھروندہ کر گیا تعمیر کون

پروین شاکر نے صد برگ کی شاعری میں جہاں گاؤں کو امن و امان کا گہوارہ قرار دیا ہے وہیں شہر کو ریاکاری اور مکاری کا مرکز گردانتی ہیں۔ گاؤں کسان کی محنت اور مشقت سے آباد رہتا ہے جب کہ شہر، شہریاروں اور امیر شہر کی گرفت میں رہتا ہے جو اپنی عظمت اور جاہ و جلال کو برقرار رکھنے کے لیے طرح طرح کے جور و ستم کرتے ہیں اور غریبوں کا خون چوستے ہیں۔

چند شعر

امیر شہر سے سائل بڑا ہے

بہت نادار لیکن دل بڑا ہے

فصیل شہر پر تھی ضرب کاری

کماں داروں کا شوق شہریاری

مشکل ہے کہ اب شہر میں نکلے کوئی گھر سے
دستار پہ بات آ گئی ہوتی ہوئی سر سے

کسی بستی میں ہو گی سچ کی حرمت
ہمارے شہر میں باطل بڑا ہے

یہ احتجاج بجا ہے کہ تیز تھی بارش
یہ ماننا ہے کہ کچا تھا اپنے شہر کا رنگ

صد برگ میں پروین شاکر کی شاعری کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے جس میں صرف عشق و محبت، ذاتی وجذباتی، دوشیزگی اور ازدواجی زندگی کے حالات و معاملات تک شعری تخلیق کو محدود نہیں رکھا، بلکہ سماجی حالات وکیفیات سیاسی واقعات، سیاست کی خرافات، حکمرانوں کے لوازمات قول وفعل کے تضادات کو بھی موضوع سخن بنایا، شعر ملاحظہ ہوں۔

شجر کو سبز قبا دیکھ کر یہ الجھن ہے
کہاں پہ رنگ نمو ہے کہاں پہ زہر کا رنگ

ابھی تک بھائیوں میں دشمنی تھی
یہ ماں کے خون کا پیاسا ہو گیا کون

کچھ اتنی تیز ہے سرخی کہ دل دھڑکتا ہے
کچھ اور رنگ پس رنگ ہے گلابوں میں

سیاسی قہر اور سماجی جبر نہ صرف انسانوں کی آزادی سلب کر لیتے ہیں بلکہ قلم پر بھی پہرہ بٹھا دیتے ہیں ایسے حالات میں گفتگو اشاروں اور استعاروں کے حوالے ہو جاتی ہے جو کارگر بھی ہوتی ہے اور بے

ضرر بھی۔ پروین شاکر نے بھی ایسے ماحول کی ترجمانی کے لیے عزت مآب، شہر، سورج اور ہوا کا استعمال کیا ہے جو ملک کی سیاست، قیادت اور حکمران کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انہوں نے انہیں اشاروں اور استعاروں کے ذریعہ صاحب اقتدار کی ہوس، انسانیت کی کمتری اور سیاست کی برتری پر خوبصورت طنز کیا ہے۔ چند شعر مناسب حال۔

گھروں پر جبریہ ہوگی سفیدی
کوئی عزت مآب آنے کو ہے پھر

سمیٹ لیتی شکستہ گلاب کی خوشبو
ہوا کے ہاتھ میں ایسا کوئی ہنر ہی نہ تھا

شہر کی ہر رہگزر پر برف خیمہ زن ہوئی
بند اگلے چاند تک اب دھوپ کا رستہ ہوا

یہ جبر وقہر صرف الفاظ وآواز کے قید وبند تک ہی محدود نہیں رہتا ہے بلکہ فنکار کے فن اور احتجاج کے ہنر کو دفن کرنے کی نئی نئی ترکیبیں بھی ایجاد کرنے پر قادر ہے۔ ایسی ذہنیت کی جرأت پر بھی پروین شاکر نے طنز کے نشتر برسائے ہیں۔

اپنے قاتل کی ذہانت سے پریشان ہوں میں
روز اک موت نئے طرز کی ایجاد کرے

جو لہو بول پڑے اس کے گواہوں کے خلاف
قاضیٔ شہر کچھ اس باب میں ارشاد کرے

صد برگ کی اس شاعری کے متعلق ڈاکٹر نجمہ رحمانی رقمطراز ہے۔

''صد برگ کی غزلوں میں سیاسی رنگ بھی نمایاں طور پر جھلکتا ہے اور اکثر یہ انداز براہ راست ہے۔ عوام کے درمیان رہ کر ارباب اقتدار کے مظالم سہہ کر بھی وہ رسم زباں بندی کی پابندی نہیں کرتیں۔ جو کچھ سامنے ہے اسے من وعن بیان کر دیتی ہیں مگر یہاں ان کا لہجہ نہ تو استفہامیہ ہوتا ہے اور نہ ہی ناصحانہ بلکہ واقعات کو محض منظر عام پر لانے پر ہی اکتفا کر لیتی ہیں، منافقت ان کا مزاج نہیں۔''(۵۸)

پروین شاکر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اشاروں میں بھی سب کچھ کہہ جانے کا ہنر رکھتی تھی اور ان کا شعری وجدان اشاروں سے قبل ہی سب کچھ سمجھ جانے پر قادر تھا۔ جس کے متعلق پروین قادر آغا یوں لب کشا ہیں۔

''پروین ایک بے حد حساس روح تھی وہ کوئی بات کہے یا پوچھے بغیر سب کچھ سمجھ جاتی تھی وہ اپنے شعری وجدان کی بدولت انسانوں کی اندرونی کیفیات کو محسوس کر لیا کرتی تھی۔''(۵۹)

پروین شاکر کی سیرت اور شخصیت نے انہیں ایک بڑی شاعرہ کی حیثیت سے زیادہ ایک عمدہ انسان کی حیثیت سے مشہور و مقبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف ادباء میں نہیں بلکہ عوام میں مقبول تھیں۔

اس کی معطر اور دل نشیں شخصیت اور شاعری نے ادباء، شعراء اور شرکاء سبھی کو بہت ہی متاثر کیا۔ جس کے متعلق زاہد فخری یوں گویا ہیں۔

''اس کا گھر ہر دل میں ہے جو درد مند ہے خواہ کوئی تاجر ہو، استاد ہو، نوجوان نسل کے لڑکے لڑکیاں ہوں، دکاندار ہو، مزدور ہو، سیاست دان ہو مجھے یقین ہے کہ وہ ہم سب کے درمیان لوک گیتوں کی طرح ہمیشہ زندہ رہے گی۔''(۶۰)

ہم جس فریب زدہ معاشرہ میں خوش ہیں۔ منافقت کی تجارت میں منافع کے متمنی ہیں۔ دوہری زندگی کو

پوری ڈھٹائی سے گزار رہے ہیں۔ وہ ان کے خلاف برسر پیکار تھی۔ ریا کاری پر ضرب کاری کرنا جانتی تھی۔ سچ کی طالب اور حق کی پرستار تھی۔ وہ یہ ظاہری نظام زیست تبدیل کرنا چاہتی تھی لیکن جب نہ بدل سکی تو اس نے اپنا ٹھکانہ بدل لیا اور اس خدا کے پاس چلی گئی جو دلوں کو موڑنا جانتا ہے۔

زندگی، خواہش، تنہائی اور وصال کا آغاز کائنات میں آدم اور حوا کی تخلیق سے ہی ہوتا ہے اور یہ سلسلہ رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گا۔ اس میں جدت اور شدت کی آمیزش زمانے کے ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے اور یہی خواہشات افزائش نسل کا پاکیزہ ذریعہ بھی ہے اور یہی ان خواہشات کو زندہ رکھنے کا وسیلہ بھی اور نشاط وصل کی آزمائش بھی ہے لیکن ان خواہشات اور کیفیات کو الفاظ کے جامہ پہنانا بہت ہی مشکل عمل ہے۔ جو صاحب فن اور ماہر فن ہی کرسکتا ہے۔ پروین شاکر کی شاعری میں یہی تحقیقی شعور ان کے فن کو ثابت کرتا ہے۔ نظم ''ہوار ہوار تھی سیرا'' کا یہ ٹکڑا دیکھیے۔

میرے آباء کی روحوں سے پرانی
لوک، قصوں، دیو، مالائی فسانوں سے بھی پہلے کی کہانی
میرے تن سے اپنا منظر لینے آئی تھی
امانت لے کے اپنی
میری شبنم رنگ پیشانی کو جب وہ چومنے آئی
تو اس کے لمس کا افسوں عجب تھا
میرا ننھا سا پیکر
اپنی وسعت میں
افق سے تا افق

ہفت آسماں تک پھیلا جاتا ہے

ہوا رہوا تھی میرا

دھنک تھامے ہوئی راسیں

بدن میرا ستارہ تھا

نظم ''نیگ'' میں بھی اسی نشاط وصل کا ذکر جمیل ہے جہاں زندگی کو منزل مقصود نصیب ہو جاتی ہے اور روح کی تشنگی غنچگی کے رس سے لبریز ہو جاتی ہے اور دنیا میں اس سے بڑی کوئی بھی نعمت بدن یا ذہن کو دیکھائی نہیں دیتی۔ جس پر سب کچھ قربان کرنے کو جی چاہتا ہے۔

صبح وصال کی پو پھٹتی ہے

چاروں اور

مدھ ماتی بھور کی نیلی ٹھنڈک پھیل رہی ہے

شکون کا پہلا پرند

منڈیر پر آ کر

ابھی ابھی بیٹھا ہے

سبز کواڑوں کے پیچھے اک سرخ کلی مسکائی

پازیبوں کی گونج فضا میں لہرائی

کچے رنگوں کی ساری میں

گیلے بال چھپائے گوری

گھر کا سارا باجرہ آنگن میں لے آئی

نظم ''گیلے بالوں سے چھنتا سورج'' شرارت، سپردگی، دودھ، شہد اور شبنم ہنی مون، کالام اولمپکس میں وصل کا نشاط اپنے شباب پر ہے۔ چاند پروین شاکر کی شاعری کا ایک مکمل استعارہ ہے۔ جو محبوب کے لیے بھی ہے، ہجر کے لیے بھی ہے اور وصال کے لیے بھی ہے۔ جو خواہشات بیدار کرتا ہے اور خواہشات پوری بھی کرتا ہے۔ نظم رسم دیکھیے۔

بہت پیار سے

بعد مدت کے

جب سے کسی شخص نے چاند کہہ کر بلایا ہے

تب سے

اندھیروں کی خوگر نگاہوں کو

ہر روشنی اچھی لگنے لگی ہے

نظم ''بلاوا اور تو نے کبھی سوچا'' محبت آشنا جیسی بہت سی نظمیں ہیں جس میں بھیگوتی، کھلکھلاتی، چاہتی پچکاریاں مارتی اور مسکراتی ہوئی وصالی کیفیت دیکھی جا سکتی ہے۔ جو صبح کو شب کی ترجمانی ہے۔ لیکن یہ تمام مسکراہٹ اور کھلکھلاہٹ وقتی ثابت ہوتی ہے۔ اس میں ثبات اور ٹھہراؤ نہیں ہے۔ یہ ایک دیکھاوا اور دھوکا تھا۔ جو خود بھی گیا اور زندگی کے لطف بھی لے گیا۔ اور پوری زندگی اسی مسکراہٹ کو چڑھاتی ہوئی گزرتی ہے۔ نظم ''کیکر تے انگور چڑھایا'' میں یہی کیفیت کھل کر بیان ہوتی ہے۔

میں ایسی شاخ کو اپنی کچی کلیاں

بارش سے قبل جلا بیٹھی

جب پھول آنے کے دن آئے

بادل کا پیار گنوا بیٹھی

کیسی کیسی بے معنی باتوں میں شامیں برباد ہوئی

کیسے بے مصروف کاموں میں اجلی راتیں برباد ہوئیں

کسی درجہ منافق لوگوں میں دل سچی بات سناتا تھا

اور جن کے قلوب پہ مہریں تھی انہیں روشنیاں دکھلاتا رہا۔

زندگی ایک امتحان ہے آزمائش ہے۔ قدم قدم پر دشواریاں ہیں اور ہر موڑ پر ایک دقت طلب فیصلہ لینا ہوتا ہے جو اکثر و بیشتر غلط ثابت ہوتا ہے اور ایک غلط فیصلہ صرف زندگی ہی نہیں زندگیاں برباد کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ یہ دشواری حساس شخص کے لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کیوں کہ وہ جو بھی فیصلہ لیتا ہے اس میں ماضی، حال، مستقبل تینوں کا دخل ہوتا ہے اور احسانات کے قرض بھی۔ اسی کیفیت کو پروین شاکر اپنی ایک نظم ایک اداس نظم میں بیان کرتی ہیں۔ جو اس طرح ہے۔

ایک طرف سہاگ ہے

اور دوسری طرف

روح کو جلانے والی آگ ہے

خود پہ برف گرتی دیکھتی رہوں

کہ روشنی کا ہاتھ تھام لوں

اے خدائے آب و نار

میرا فیصلہ سنا

زندہ دفن ہوں

کہ زندگی کا ہاتھ تھام لوں

صد برگ کی نظموں میں جہاں وصل کی کیفیت، ہجر کی داستان اور بارش و بہار کا ذکر ہے۔ وہیں سماج کے مسائل، سیاست کے جرائم اور نسائی دکھ درد پر کثرت سے نظمیں مل رہی ہیں۔ جس میں سنجیدگی بھی ہے اور تلخی بھی ہے اور دعاؤں کا سہارا بھی اور ساتھ ہی ساتھ حماقت اور معصومیت کے فرق پر طنز بھی ہے۔ ان نظموں میں تقیہ، روز سیاہ، مارگزیدہ، کتوں کا سپاس نامہ، در کنگ ومن، کنیادان، ایک معقول نکاہ، خاکم بدن، نک نیم، ہاں ابھی دعائے نور پڑھی جاسکتی ہے، شگون، ادرکنی ظلِ الٰہی کے پرابلمز اور ٹکٹکی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

پروین شاکر اپنی ادوازجی زندگی کی ناکامی، مقدس رشتہ کا بکھراو، خواہشات کے تصادم، خیالات کے تفاوت اور اپنی تقدیر پر نظم ''شگون'' میں اس طرح ماتم کناں ہیں۔

سات سہاگنیں اور میری پیشانی
صندل کی تحریر
بھلا پتھر کے لکھے کو کیا دھوئے گی
بس اتنا ہے
جذبے کی پوری نیکی سے
سب نے اپنے اپنے خدا کا اسم مجھے دے ڈالا
اور یہ سننے میں آیا ہے
شام ڈھلے جنگل کے سفر میں
اسم بہت کام آتے ہیں

نظم ''ٹکٹکی''، میں انہوں نے سیاست کا وہ بدترین چہرا پیش کیا ہے جس میں معصوم اور مقدس لوگوں کو قتل

کر کے اپنے ہوس اقتدار کی تکمیل کرتے ہیں۔

پروین شاکر جب حالات سے پریشان ہو جاتی ہیں تو روحانیت کا سہارا لیتی ہیں اور خواہش دعاؤں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں یہ غور کرنے کی بات ہے کہ کھوپے پہننے سے انکار کرنے والی یہ لڑکی بالآخر اسی قرآنی آئین کے آغوش میں پناہ ڈھونڈھتی ہے۔کبھی علی مشکل کشا کو آواز دیتی ہے۔تو کبھی دعائے نور پڑھتی ہے تا کہ بلاؤں کو رد کیا جا سکے اور مشکلیں کھل جائیں۔

ہاں ابھی دعائے نور پڑھی جا سکتی ہے

رد بلا کے اسم ابھی تک اپنی تاثیروں سے منافق نہیں ہوئے

حرف دعاء میں آس کی لو تابندہ ہے

نظم کے آخر میں یہ انداز

کوئی معجزہ والا ہاتھ..............اے موسیٰ کے خدا

کوئی جلانے والی سانس..........اے رب عیسیٰ

کوئی محبت والی آنکھ...............اے محبوب محمدؐ

ورکنگ وومن میں اس کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ کہ مرد و زن کے بغیر کوئی تخلیق ممکن ہی نہیں۔تنہا خواہ کوئی کچھ بھی ہو جائے لیکن منزل انسانیت نہیں پا سکتا اور اس کی فطری ضروریات اور خواہشات بغیر ایک دوسرے کے پوری نہیں ہو سکتی ہیں۔خواہ جدید تہذیب کوئی بھی جواز پیش کرے فطرت کی روش بدل نہیں سکتی۔ نظم کا آخری بند دیکھیے۔

ایک تنا در پیڑ ہوں میں

اور اپنی زرخیز نمو کے سارے امکانات کو بھی پہچان رہی ہوں

لیکن میرے اندر کی یہ بہت پرانی بیل

کبھی کبھی جب تیز ہوا ہو

کسی بہت مضبوط شجر کے تن سے لپٹنا چاہتی ہے۔

نوجوان ہی قوم کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور اسی سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ لیکن جس قوم کے نوجوان ہی نشہ آور گولیوں کے شکار ہو جائیں اس قوم کو کوئی بھی بچا نہیں سکتا ہے۔ پروین نے اس نئی نسل کو ہدف ملامت بنایا۔ انہیں تسنیم وکوثر کا حوالہ دے کر انہیں غیرت دلائی کہ ان کا یہ فعل معصومیت نہیں بلکہ حماقت ہے۔ نظم ''برگزیدہ'' اس کی بہترین عکّاسی کرتی ہے۔

معصومیت اور حماقت میں پل بھر کا فاصلہ ہے

میری بستی میں پچھلی برسات کے بعد

اک ایسی اعصاب شکن خوشبو پھیلی ہے

جس کے اثر سے

میرے قبیلہ کے سارے زیرک افراد

اپنی اپنی آنکھوں کی جھلی مٹیالی کر بیٹھتے ہیں

سادہ لوح تو پہلے ہی

سرکنڈ و اور چنبیلی کے جھاڑوں کے پاس

بے سدھ پائے جاتے تھے

ذہن کے اندر گھلتے ہی

نیم کے پتوں کا یوں برگ گلاب ہو جانا مجبوری تھی

حیرت تو اس بات پہ ہے کہ

آگ کے پودوں کی موجودگی کے باوصف

وارث تسنیم و کوثر

ایسی لعاب آلود مٹھاس کو آب وحیات سمجھ بیٹھے

معصومیت اور حماقت میں پل بھر کا فاصلہ ہے

نک نیم ایک بہترین تمثیلی نظم ہے۔ جس میں ایک گڑیا کے کردار میں بنت حوا کی تفسیر پیش کی گئی ہے۔ جس میں لڑکی کو ہمیشہ مجبور محض قرار دیا ہے۔ جس کا قبر کے علاوہ کوئی وطن نہیں۔ مجبوری کے علاوہ کوئی خواہش نہیں۔ کسی سے کوئی جنگ نہیں۔ صرف ایک کھلونا کی حیثیت ہے۔ جس سے دل بھر کر کھیلا جاتا ہے اور پھر پھینک کر دوسری گڑیا کی تلاش ہوتی ہے۔ جس کی خوبصورتی، بینائی، دیدہ وری، سب کچھ دوسروں کا ہے اس کا کچھ نہیں علاوہ غلامی اور مجبوری کے۔ اس کے باوجود بھی وہ خوش ہے کہ تم جو کچھ کہتے یا کرتے ہو ٹھیک ہی ہے۔

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو

ٹھیک ہی کہتے ہو

کھیلنے والے سب ہاتھوں کو میں گڑیا ہی لگتی ہوں

جو پہنا دو مجھ پہ سجے گا

میرا کوئی رنگ نہیں

جس بچے کے ہاتھ تھما دو

میری کسی سے جنگ نہیں

سوچتی جاگتی آنکھیں میری

جب چاہے بینائی لے لو

کوک بھرو اور باتیں سن لو

یا میری گویائی لے لو

مانگ بھرو سندور لگاؤ

پیار کرو آنکھوں میں بساؤ

اور پھر جب دل بھر جائے تو

دل سے اٹھا کر تاک پر رکھ دو

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو

ٹھیک ہی کہتے ہو

پروین شاکر نے صد برگ کی شاعری میں عورت کی مجبوری، ماضی سے وابستگی، سماج کی بندگی اور سیاست کی گندگی کی نہ صرف نشاندہی کی ہے۔ بلکہ اس کے خلاف برسر پیکار بھی نظر آئیں جس کے لیے انہوں نے اپنی تحریروں میں زور لانے کے لیے قرآن کریم کی آیات اور کربلا کے استعارات کا کثرت سے استعمال کیا ہے تا کہ انہیں بھی تقویت پہنچے اور ان کے فن کو بھی جوان برائیوں کے خلاف میدان کارزار میں ہے اور ظاہر سی بات ہے کہ میدان کارزار کی زبان خوشبو اور خوبرد کی زبان نہیں ہوسکتی بلکہ اس میں آہ و پکار، للکار اور جنگ کی جھنکار ہی سنی جاسکتی ہے۔ اس لیے صد برگ کی زبان خوشبو کی زبان سے الگ ہے۔

جس کے متعلق نجمہ رحمانی لکھتی ہیں۔

''صد برگ کے لہجے کی تلخی، کرختگی اور سختی اپنی جگہ درست ہے یہاں انہوں نے محبوبہ بن کر عشقیہ زبان کو منعکس ہی نہیں کیا بلکہ سماج کا فرد بن کر زندگی کی بے رحم حقیقتوں اور سفاکیوں کے پردوں کو چاک کرنے کی کوشش کی ہے۔'' (۶۱)

خوشبو اور صد برگ کے فرض کو واضح کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں۔

''خوشبو کی دلاویزی اور دل گدازی اس لیے لوگوں کو محبوب رہی کہ اس کے جذبوں اور لفظوں میں انہوں نے وہ آئینے دیکھے تھے۔ جن میں خد و خال کے علاوہ پسِ خد و خال کی کیفیات بھی منعکس تھی۔ صد برگ میں اس سچائی نے ماورائے ذات کے آفاق پر بھی ایک در کھولا اور کہیں کہیں یہ سچائی اس طنز کا لہجہ بھی اختیار کر گئی جو موجودہ صورت حالات سے مطمئن حق گوئی کا لہجہ ہے۔

''ہنسی کو اپنی سن کے ایک بار میں بھی چونک اٹھی
یہ مجھ میں دکھ چھپانے کا کمال کیسے آ گیا'' (۶۲)

خالدہ حسین کانچ کی گڑیا کے عنوان سے صد برگ کے متعلق یوں لب کشا ہیں۔

''صد برگ سے پروین شاکر اجتماعی نقطۂ نظر کا اعلان کرتی ہیں۔'' (۶۳)

باب پنجم

مجموعۂ کلام

”خود کلامی“

کا

تنقیدی جائزہ

خود کلامی پروین شاکر کا تیسرا شعری مجموعہ ہے، جو ۵۳ر نظموں، ۳۸ر غزلوں، ۱۸۲ صفحات پر مشتمل ہے اور مراد کے نام معنون ہے۔ جس کی اشاعت ۱۹۸۵ء میں ہوئی۔ جس کو ہندی زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کا "منتھن اور چنتن" جہاں نہ تو خوشبو کی غنچگی، شگفتگی اور دوشیزگی ہے اور نہ ہی صد برگ کی تندی، سختی اور کرختگی ہے۔ بلکہ ایک ماں کی زبان ہے جو ممتا اور مصالحت پر مبنی ہے۔ جہاں خوابوں کی گزشتہ زندگی بھی ہے۔ صفا و مروہ کی بے چینی بھی اور پنجوں کے بل کھڑے ہو کر مستقبل میں جھانکنے کی کوشش بھی ہے۔ جہاں خارجی مسائل بھی ہیں اور داخلی درد بھی، خارج اور باطن میں تصادم اور کشمکش بھی ہے۔ ماضی کے حوالے سے خود کو ثابت قدم بھی رکھتی ہیں۔ روح کی تنہائی اور دکھوں کی ردا کو سمیٹنے کی کوشش میں بکھرتی ہوئی بھی نظر آتی ہیں۔ شکست خوردہ بھی ہیں اور ظرف یاب بھی، سب کچھ برباد ہو جانے کا غم بھی ہے اور وجود کو بچا لینے کی خوشی بھی ہے۔ خالق کائنات کے سامنے اشک ریز بھی اور تخلیق مراد پر سجدہ ریز بھی، محبوب کے ہاتھوں مجبور بھی، محبوب ترین سے مل جانے پر مسرور بھی، محبوب کی حسن کی تعریف بھی، مراد کے جشن کی تائید بھی، لیکن سب میں ایک اعتدال پایا جاتا ہے کیونکہ ماں قہقہے لگا دے تو دنیا کی سنجیدگی ختم ہو جاتی ہے اور مایوس ہو جائے تو دنیا ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس شعری مجموعہ میں ان کی شاعری وسیع تر ہونے کے ساتھ ساتھ گمبھیر بھی ہوتی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے انہیں رجحان ساز شاعرہ کہا جانے لگا۔ انہوں نے اس مجموعہ میں بھی انہیں موضوعات کا احاطہ کیا ہے جن کا تعلق نسوانیت، سماجیات اور سیاسیات سے ہے۔ جو زندگی کے ہر قدم پر الجھتے رہتے ہیں۔

عشق نے سیکھ ہی لی وقت کی تقسیم کہ اب
وہ مجھے یاد تو آتا ہے مگر کام کے بعد

پرین شاکر کی شاعری میں اس کے محبوب کا جو کردار سامنے آتا ہے۔ وہ روشن جبیں اور سنجیدہ گفتار اس کی

شخصیت میں رکھ رکھاؤ اور ٹھہراؤ ہے۔ وہ زود رنج اور ہوا کا مزاج رکھتا ہے اس کے باوجود بھی وہ اس سے محبت کرتی ہے لیکن محبت پاتی نہیں۔ جب یہ سلسلہ بدستور جاری رہتا ہے تو وہ اس کو پرائے شخص کے روپ میں دیکھنے لگتی ہے۔ جو اس کی چاہت میں اور کشش پیدا کر دیتا ہے اور اپنے محبوب کے لیے بار بار لفظ ایک شخص کا استعمال کرتی ہے۔ جس سے اجنبیت کا شدید احساس بھی ہوتا ہے لیکن سب کچھ کے باوجود اس کی شخصیت کی کشش کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

بھرم ہے مہر و ماہ و نجم کا بھی بس جب تک
مقابل ان کے وہ روشن جبیں نہیں آتا
اس کا انداز سخن سب سے جدا تھا شاید
بات لگتی ہوئی لہجہ وہ مکر نے والا

پروین شاکر کی شاعری میں آس اور یاس، امید اور مایوسی، حسرت اور خواہش کا کارواں ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ خوشی کی آمد ضرور ہوتی ہے لیکن جلد ہی محرومی غالب آ جاتی ہے۔ اور یہ نشیب و فراز مسلسل رواں دواں ہے۔

گاہ قریب شاہ رگ گاہ بعید وہم و خواب
اس کی رفاقتوں میں رات ہجر بھی تھا وصال بھی
زندہ بچا نہ قتل ہوا طائر امید
اس تیر نیم کش کا نشانہ عجیب تھا

خوشبو اور صد برگ میں اپنے محبوب کی تعریف جس انداز میں کرتی تھیں اسی طرح اس کی شکوہ و شکایت بھی کرتی تھیں جن کے الفاظ بہت ہی سخت اور دھار دار ہوتے تھے لیکن یہاں تک آتے آتے ان کے شکوہ کے

انداز میں سنجیدگی آ گئی ہے۔ جو فن کی پختگی کی دلیل ہے۔

رائے پہلے سے بنا لی تو نے

دل میں اب ہم تیرے گھر کیا کرتے

خود کلامی کی شاعری میں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ پروین نے تعلقات استوار کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا شریک حیات ترک تعلقات پر ہی مائل تھا لیکن ایسے بھی اشعار ملتے ہیں جس میں وہ خود کو ہی قصوروار مانتی ہے۔ یہ سچائی ہے یا صرف انکساری اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

ہم خود بھی جدائی کا سبب تھے

ان کا ہی قصور سارا کب تھا

بے وفائی میری فطرت کے عناصر میں ہوئی

تیری بے مہری کا اسباب دگر پر رکھا

گھر اور جنگل کا ذکر پروین شاکر کی شاعری میں بار بار آتا ہے اور دونوں کی خصوصیت بالکل جدا جدا ہے۔ گھر جہاں تحفظ ہی تحفظ ہے اور جنگل جہاں خطرات ہی خطرات لیکن سکون اور وحشت کا تعلق دل سے ہے۔ جب دل میں وحشت پیدا ہو جائے تو گھر جنگل سے بھی زیادہ خطرناک لگنے لگتا ہے اور جب دلی سکون واطمینان ہو تو جنگل تفریح گاہ بن جاتا ہے جہاں صرف سکون اور شانتی ہوتی ہے۔ پروین شاکر کی شاعری میں بھی یہی کیفیت جلوہ گر ہے، جہاں گھر سکون نہیں دے پا رہا ہے۔

وہی تنہائی وہی دھوپ وہی بے سمتی

گھر میں رہنا بھی ہوا راہ گزر میں رہنا

یہی کیفیت اور بے چینی اس کے دل میں تیری ذات یعنی رقیب کے خدشات کو بھی جنم دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اور بھی پریشان ہو جاتی ہے اور خود کو اس طرح تسلی دیتی ہے۔

اب اور کے ساتھ ہے تو کیا دکھ
پہلے بھی کوئی ہمارا کب تھا
خوشبوئے غیر تن سے آتی ہے
بازوؤں میں مجھے سموتا ہے

خود کلامی کی شاعری میں بھی رومانیت کا عنصر جابجا دیکھا جا سکتا ہے وہ اپنی ایک نظم ''سرشاری'' میں اس فطری سرمستی کا ذکر کرتی ہیں جو خدا کی طرف سے ودیعت کردہ ہیں جب صرف زبان کو نہیں بلکہ بدن کو بھی قوت گویائی اور طاقت سماعت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس موسم اور کیفیت کی پیکر تراشی ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

ہاں یہ موسم تو وہ ہے
کہ جس میں نظر چپ رہے
اور بدن بات کرتا ہے
اس کے ہاتھوں کے شبنم پیالوں میں
چہرہ مرا
پھولوں کی طرح ہلکورے لیتا رہا
پنکھڑی پنکھڑی
اس کے بوسوں کی بارش میں
پیہم نکھرتی رہے

زندگی اس جنون خیز بارش کے شانوں پہ سر کو رکھے

رقص کرتی ہے

اس طرح محبوب کی آواز کی تعریف اس شاعرانہ انداز میں کرتی ہیں۔

کتنی شفاف ہے یہ آواز

چشمے کی طرح سے جس نے میرے

اندر کے تمام موسموں کو

آئینہ بنا کر رکھ دیا ہے

پروین شاکر کی شاعری کے ہر کردار میں رومانیت غالب ہے لیکن وہ رومانیت نہیں جس کی تعریف نقاد کرتے ہیں بلکہ وہ رومانیت جس کے متعلق احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں۔

''جسے رومانیت کہتے ہیں دراصل وہ سچ ہے جسے معاشرہ کے بعض اندھے رواجوں اور مسلط نظاموں نے پامال کر رکھا ہے۔ سچا جذبہ، سچی بات اور سچا عمل ہی رومانیت ہے اور اس لفظ کے اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر ہر وہ شاعر جس نے بڑی شاعری تخلیق کی ہے۔ اس حقیقت افروز رومانیت سے بہرہ اندوز ہے اور آج اردو شاعری کی سرزمین پر پروین کی بیک وقت دلاویز اور دلگداز رومانیت آسمان کی طرح چھا رہی ہے۔'' (۶۴)

نظم ''انہونی'' کی ایک دعا میں جو کردار اور کیفیت کا ذکر ہے وہ علامت ضعیفی ہے جہاں ان کو اپنے بال میں ایک بال سفید نظر آیا پہلے تو انہوں نے اپنی بینائی کا قصور مانا لیکن جب حقیقت واضح ہوگئی تو اسے چاندی کا تار کہہ کر یاد کیا جسے خود کے لیے بھی اور اپنے پرستاروں کے لیے بھی ایک بری خبر قرار دی۔ اس میں بھی انہوں نے پرستاروں پر اور موقع پرستوں پر طنز کیا ہے۔ کہ یہاں عشق و محبت اور سب کچھ ایک ہوس، تجارت اور اداکاری ہے۔ جہاں صرف لالچ اور ظاہر داری ہے تاکہ چہرہ دیکھ کر بیج بو کر چھٹکارہ حاصل کر لیا جائے کیونکہ

عورت سامانِ تسکین نفس ہے اور اس سے رشتہ صرف تسکین تک کا ہی ہے زندگی کا نہیں اور جب یہ لائقِ تسکین نفس نہیں تو اس سے چھٹکارا ہی عقل مندی کی دلیل ہے۔ پروین شاکر زمانے کی اسی روش پر اس انداز میں چوٹ کرتی ہیں۔

آج ہمہ تن چشم وہ لوگ
مجھ کو کیسے دیکھیں گے
دیکھ سکیں گے
مالک اس انبوہ طلب میں
کیا کوئی ایسی آنکھ بھی ہوگی
جس کی چمک
بجھ جانے کے بجائے
چاندی کے اس تار کو چھو کر
سونے جیسی ہو جائے

ریا کاری، مکاری، غداری اور عیب جوئی پر پروین شاکر خود کلامی میں جم کر طنز کرتی نظر آ رہی ہیں۔ اپنی ایک نظم "فبایِّ ء الاء ربکما تکذبان" میں کرتی ہیں۔ نظم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

دل آزاری بھی ایک فن ہے
اور کچھ لوگ تو
ساری زندگی اس کی روٹی کھاتے ہیں
چاہے ان کا برج کوئی ہو

عقرب ہی لگتے ہیں

تیسرے درجے کے پیلے اخباروں پر یہ

اپنی یرقانی سوچوں سے

اور بھی زردی ملتے رہتے ہیں

خود کلامی میں اس طرح کی بہت سی نظمیں ملتی ہیں جس میں پروین شاکر نے زمانے کے ہر پہلو کو نشانہ بنایا ان کی نگاہوں نے جہاں بھی اس طرح کا نظام زیست دیکھا اس کی مذمت کیا اور اپنی فنی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کی بیخ کنی کی۔

''پروین شاکر کے اس کارنامے کی تعریف احمد ندیم قاسمی اس انداز میں کرتے ہیں۔

اب خود کلامی میں سچائی کی اس دھار نے پروین شاکر کی شاعری میں ایسی کاٹ پیدا کر لی ہے کہ اس تصنع بھرے، ریا کار منافق اور زر پرست معاشرے کا شاید ہی کوئی جھوٹ اس کی زد سے بچ رہا ہو۔ حیرت اور مسرت کی بات یہ ہے کہ پروین نے سیکڑوں میں پہچانے جانے والے اپنے لہجے کی انفرادیت کی قربانی دیے بغیر اس تیز دھار کو بڑے مؤثر انداز میں استعمال کیا ہے۔'' (۶۵)

خود کلامی میں پروین شاکر نے سماجی برائی کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے کہ یہاں ہر شخص احساس برتری کا شکار اور خود کو سب سے بہتر شاعر، دانشور، مبلغ، معلم اور پرہیز گار سمجھتا ہے اور دوسروں کو انتہائی گری نگاہوں سے دیکھتا ہے لیکن حقیقت میں یہ اس کی احساسِ کمتری ہے۔ جس نے انہیں اس روگ میں گرفتار کر رکھا ہے۔ جو خود شناس بھی نہیں لیکن خود شناس ہونے کا دعویٰ کرتے پھرتے ہیں ان کی حالت وہی ہے جو سگ گزیدہ کی ہوتی ہے جسکو پانی میں اپنی ہی شکل نظر آتی ہے۔ نظم ''ہمارا المیہ یہ ہے'' کا آخری بند دیکھیے۔ جو انتہائی دلچسپ ہے۔

مثال سگ گزیدہ

اب کبھی آب رواں کا دیکھنا ممکن نہیں اپنا

کوئی ہم کو دیکھائے بھی تو کیسے

پلوں سے کتنا پانی بہہ چکا ہے

اس طرح ہمارا پورا سماج فریب میں مبتلا ہے خودنمائی اور غودغرضی کی ہوڑ لگی ہوئی ہے۔ اخلاقی پستی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکی ہے۔ اپنی پوری صلاحیت دوسروں کی عیب جوئی میں صرف کردیتے ہیں اور کبھی اپنے دامن یا اپنی ذات کی طرف اپنا رخ نہیں کرتے۔ یہ سب سے بڑا المیہ ہے۔

''ایک تنہا سیارہ'' بھی پروین شاکر کی اچھی نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ جس میں وہ اپنے وجود، قسمت، نام اور کمسٹری کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تنہائی، قسمت اور محبوب سے دوری کو انتہائی دلکش انداز میں بیان کرتی ہیں کہ ان کی مانگ میں کوئی بھی افشا بھرنے والا نہیں ہے۔ سورج یعنی زندگی میں روشنی بھرنے والا بھی بہت دور جا چکا ہے اور اس کائنات کی وسعت میں وہ تنے تنہا ہیں، نظم دیکھیے۔

میری پیشانی کو دیکھ کے

میری ماں نے میرا نام

ایک تارے کے نام پہ رکھا

جگمگ کرنے والا

لیکن میری کمسٹری میں

ایسا کوئی طلسم نہیں ہے

جو میری تقدیر کو جھل مل کر دے

میری مانگ میں اس کے نام کی افشا بھر دے

میں اپنے سورج سے

ہزاروں نوری سال کے فاصلے پر ہوں

کائنات کی بے اندازہ وسعت میں

اک تنہا سیارہ ہوں

پروین شاکر کی رنگین نظم ''آج کی رات'' ہے جس میں روح کی تشنگی جسم کی پیہم آواز، دلِ خشد کی خواہش، قرب کی آسائش، خوابوں کا نشہ، باتوں کی دھنک، رگ و پے کی روشنی، تازہ بارش، ہونٹوں کی نمی، بانہوں کا حصار یعنی ملاقات کی یاد تجدید ملاقات کے لیے جلوہ فگن ہے۔ نظم کا آخری بند دیکھیے۔

ذہن میں گھومتا ہے پہلے پہل کا ملنا

اور پھر رنگ ملاقات کا گہرا ہونا

اور پھر ملنے کی خواہش کا سمندر ہونا

دھیرے دھیرے کسی تصویر کے ٹکڑے ملنا

جس کی ترتیب نے دو روحوں کا سمبندھ دیکھا

اور یہ سچ ہے

کہ حیرت کدۂ ہستی میں

ایک پہچان کا لمحہ بھی ہوتا ہے

ہم پہ اس لمحے کا کچھ قرض ہے باقی اب تک

تن میں تن جذب کریں

روح میں روح سموئیں

کہ یہ ساعت ہے تشکر کے لیے

ریگ صحرا پہ اتر آئی ہے برسات کی رات

آج کی رات ہے تجدید ملاقات کی رات

تنہائی اس زمانے کا بہت بڑا مسئلہ ہے کیونکہ ہر شخص اپنے روشن مستقبل کے چکر میں حال اور ماضی کی قربانیاں دینے پر تیار ہے۔ آباء واجداد کی سرزمیں ہی نہیں، آباء واجداد کو بھی ترک کرنے پر آمادہ ہیں۔ صرف آسائش جسم اور نمائش علم کے چکر میں تا کہ ترقی یافتہ ہونے کا سہرا سر بندھ جائے لیکن یہ لوگ اپنے خواب کی تکمیل کے لیے جس جگہ کا انتخاب کرتے ہیں وہاں یہ تمام لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صرف موقع پرست یا فائدہ پسند ہیں۔ وہاں انسان اور انسانیت یا اخلاق و کردار کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ہر شخص دوسرے کو دھکا دے کر آگے جانے کی کوشش کرتا ہے جبکہ یہ لوگ جس جگہ کو اور جس سرزمین کو چھوڑ کر آتے ہیں وہ ان کی اپنی ہوتی ہے۔ جہاں خلوص کا جذبہ تھا علم کی قدر تھی، انسانیت کی عزت تھی اور ترقی کے زینے بھی تھے لیکن ان لوگوں نے اس سے غداری کی اس لیے یہ زمین ان کو راس نہیں آسکتی کیونکہ ماں کی خدمت اور باپ کی عزت پھولوں اور تحفوں سے نہیں کی جاسکتی۔ ان کو تو لمس کی حدت اور اولاد کی قربت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو پروین شاکر اپنی ایک نظم ''ایک شاعرہ کے لیے'' میں بیان کرتی ہیں۔ یہ نظم ان سے یعنی پروین شاکر سے ہی یہ کہتی ہے کہ بھیڑیے اور ہرنی کی دوستی کبھی نہیں ممکن ہے۔

ذرا سی چھاؤں کی آس میں تو نے

کیسے گھر کو چھوڑا

مانا کی دیوار تھی کچی

اور ٹپکتی رہتی تھی چھت
خواب گاہ میں شام شام تک دھوپ بھری رہتی تھی
لیکن یہ مٹی جس پر یہ گھر ایستادہ تھا
جس پر تیرے پاؤں جمے تھے
وہ تو تیری اپنی تھی
سدا محبت کرنے والی
ماں کی طرح تیرے سب تیکھے لہجوں کو
ہنس ہنس کر سہہ جاتی تھی
شہر کا شہر جب تجھ پر باتیں کرتا تھا
کس نے تیرے سر پر ہاتھ رکھا
جب بھی بارش تیز ہوئی تو تیری خاطر
کس کے بازو پھیلے تھے
جب بھی زور ہوا نے باندھا
تیرے گھر کے سارے دیوں کو کس نے جلائے رکھا تھا
تیرے اک اک شعر کو کس نے سرمۂ چشم بنایا تھا
آج وطن پر وقت پڑا تو
تجھ کو اپنا مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا
ماں کی خدمت

پھولوں اور تحفوں سے کب ہو سکتی ہے

اسے تو تیرے لمس کی حدت ہے درکار

تجھے نئی دنیا کی مبارکباد

مگر یہ بات گرہ میں باندھ کے رکھ لے

جس جنگل کو تو نے اپنا گھر سمجھا ہے

بھیڑیوں اور ریچھوں سے بھرا پڑا ہے

پروین شاکر کے شعری مجموعہ خود کلامی میں ممتا کا جز نقطۂ عروج ہے جہاں ماں اپنے شاہکار پر مسرور ومغرور ہے۔ یہ جذبہ اس کی شخصیت میں استقامت اور استقلال پیدا کرتا ہے اور وہ خود کو مکمل محسوس کرتی ہے۔ اور دنیا کے ہر چیلنز کا سامنا کرنے کے لیے تیار کیونکہ تخلیق کرنا وصف خداوندی ہے یہ کارنامہ انجام دینے کے بعد وہ خوش وخرم رہتی ہے۔خود کلامی میں ایسی پانچ نظمیں ہیں جن میں یہ جذبہ کارفرما ہیں۔ان نظموں میں جواز، میرالال، تیری موہنی صورت، کائنات کے خالق اور نوشتہ قابل ذکر ہیں۔

نظم جواز میں یہی جواز پیش کیا گیا ہے کہ صرف ایک زندگی ایک اولاد تمام اداسیوں کو خوشیوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔زندگی میں روشنی اور بے برگ شجر کو ثمر آور کر دیتی ہے۔تاریکی، ناامیدی اور خوف رخصت ہو جاتے ہیں خوشی خوش آمدید کہتی ہے۔ نظم جواز دیکھیے۔

کتنی سنسان زندگی تھی

سب طاق میرے دیے سے خالی

بے برگ وثمر بدن کی ڈالی

کھڑکی پہ نہ آکے بیٹھے چڑیا

آنگن میں بھٹک سکے نہ تتلی

سنجوگ کی بے نمو رتوں سے

میں کتنی اداس ہو چلی تھی

آواز کے سیل بے پنہ میں

میں تھی مرے گھر کی خامشی تھی

پر دیکھ تو آ کے لال میرے

اس کلبۂ غم میں مجھکو تیرے

آنے کی نوید کیا ملی

جینے کا جواز مل گیا

نظم ''میرا لال''، میں یہی فکر علامتی انداز میں بیان ہوئی ہے اس نظم میں وہ اپنی زندگی کو زرد آنگن سے اور بیٹے کو سرخ پھول سے تشبیہ دے رہی ہیں۔

اس طرح پوری نظم میں رنگوں کا علامتی انداز ملتا ہے۔ زرد آنگن، سرخ پھول، نقرئی کرن، کاسنی، سبز باد، زرد کے علاوہ تمام رنگ خوشی مسرت اور شگون کی علامت ہیں اور روشن مستقبل کی ضمانت بھی، یہ نظم مختصر اور پر اثر ہے۔ نظم کا انداز دیکھیے۔

میرے زرد آنگن میں

سرخ پھولوں کی خوشبو

نقرئی کرن بن کر

کاسنی دنوں کی یاد

سبز کرتی جاتی ہے

تیری موہنی صورت میں بھی یہی پیغام ہے کہ زندگی کا ایک روشن چاند یعنی اولاد تمام تاریکیوں کو دور کرنے پہ قادر ہے اور جب زندگی کی روش روشن ہو تو حالات اپنے آپ ہی خوشگوار اور موافق ہو جاتے ہیں۔ نظم ''تیری موہنی صورت'' کا انداز دیکھیے۔

ہاں مجھے نہیں پروا
اب کسی اندھیرے کی
آنے والی راتوں کے
سب اداس رستوں پر
ایک چاند روشن ہے
تیری موہنی صورت

اور یہی ناچیز شے جب خالق کے مقام پر براجمان ہوتی ہے زندگی جنم دیتی ہے تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ وہ صرف خاکی سے ہی نہیں بلکہ مالک خاکی سے بھی یوں ہم کلام ہے۔ نظم کائنات کے خالق کا یہ انداز تخاطب ملاحظہ ہو۔

کائنات کے خالق
دیکھ تو مرا چہرہ
آج میرے ہونٹوں پر
کیسی مسکراہٹ ہے
آج میری آنکھوں میں کیسی جگمگاہٹ ہے
میری مسکراہٹ سے تجھکو یاد کیا آیا

میری بھیگی آنکھوں میں

تجھکو کچھ نظر آیا

اس حسین لمحے کو

تو تو جانتا ہوگا

اس سمے کی عظمت کو

تو تو مانتا ہوگا

ہاں تیرا گماں سچ ہے

ہاں کہ آج میں نے بھی

زندگی جنم دی ہے

نظم ''نوشتہ'' میں وہ اپنے بیٹے کے وجود اور اس کی شناخت و پہچان کو لیکر فکر مند ہیں۔ اور پدر بنیاد نظام پر طعنہ زن ہیں۔ جہاں عورت کی شہرت ومقبولیت اس کے بدچلن ہونے کی دلیل ہوتی ہے اور اولاد صرف والد سے منسوب ہوتی ہے۔ ماں سے منسوب ہونا یا ماں کا مقبول ہونا ایک گالی تصور کی جاتی ہے۔ ان کو فکر تھی کہ ان تمام بندشوں اور خرافاتی نظاموں سے ان کے بیٹے کو گزرنا ہوگا اور شاید اس کو تکلیف پہنچے۔ اس نظم کے ذریعہ دراصل وہ پورے نظام مشرق کے معیاری پستی اور اخلاق زوال پر خوبصورت اور سنجیدہ طنز کیا ہے۔ یہ طویل نظم اپنے آنچل میں وسیع پیغام رکھتی ہے۔ اس لیے پوری نظم پیش کی جاتی ہے۔ جس میں وہ اپنے بچے سے مخاطب ہیں۔

میرے بچے

تیرے حصے میں بھی یہ تیر آئیگا

تجھے بھی اس پدر بنیاد دنیا میں بلآخر
اپنے یوں مادر نشاں ہونے کی ایک دن
بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی
اگرچہ
تیری ان آنکھوں کی رنگت
تیرے ماتھے کی بناوٹ
اور تیرے ہونٹوں کے سارے زاویے
اس شخص کے ہیں
جو تیری تخلیق میں ساجھی ہے میرا
فقیہہ شہر کے نزدیک جو پہچان ہے تیری
مگر جس کے لہو نے تین موسم تک تجھے سینچا ہے
اس تنہا شجر کا
اک اپنا بھی تو موسم ہے
لہو سے فصل تارے چھاننے کی
سوچ سے خوشبو بنانے کی رتیں
اور شعر کہنے کا عمل
جن کی عملداری تیرے اجداد کے قلعوں سے باہر جا چکی ہے
اور جسے واپس بلا سکنا

نہ سیفو کے لیے ممکن رہا تھا

نہ میرا کے ہی بس میں تھا

سواب ہمجولیوں میں

گاہے گاہے تیری خجلت

واقفوں کے آگے تیرے باپ کی مجبور خفت

اس گھرانے کا مقدر ہو چکی ہے

کوئی تختی لگی ہو صدر دروازے پہ لیکن

حوالہ ایک ہی ہوگا

تیرے ہونے نہ ہونے کا

پروین شاکر کی شاعری میں میرا سیفو اور فروغ فرخزاد کا ذکر بار بار آتا ہے۔فروغ فرخزاد پر تو ایک طویل نظم بھی ہے۔جبکہ میرا سیفو اور طاہرہ سے وہ متاثر ہیں کیونکہ ان کی شاعری میں ان کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔جس کے متعلق نظیر صدیقی رقم طراز ہیں۔

''میرا اور پروین شاکر دونوں کی شاعری بنیادی طور پر ایک عورت کے عشق کی شاعری ہے اس میں دونوں کی کامیابی کے درجے یقیناً مختلف ہونگے لیکن دونوں کو جس حد تک بھی کامیابی نصیب ہوئی اس کا راز دونوں کے اندر عشق کی غیر معمولی صلاحیت میں پوشیدہ ہے۔''(٦٦)

پروین شاکر نے اپنے ہر مجموعے کلام میں حالات کے ساتھ ساتھ لفظیات کو بھی تبدیل کیا ہے۔خوشبو میں رنگ، دھنک، خواب اور پھول سے جو الفاظ تراشے گئے ہیں، وہ صد برگ میں حالات بدلنے پر زہر رنگ سانپ، دھوپ، اسم، مقتل، تیر، تعزیر، بھیڑیے، جنگل اور شہر میں تبدیل ہو گئے اور خود کلامی میں ان لفظیات کو

انگریزی جامہ عطا کیا، جہاں مسفٹ ، بلڈ گروپ، ادمنفی، نیل پرنٹ، آئسو ٹوپس، کمسٹری، نیوٹرونز تابکار، فریکونسی، ویولینتھ نے لے لیا۔اس طرح الفاظ کے ستیاروں نے اپنا روپ بدل بدل کر پروین شاکر کی شاعری کو منور کیا ہے اور پروین شاکر نے ان کا بہترین استعمال کر کے نہ صرف اپنی تخلیق کو زندہ و جاوید کیا بلکہ ان ستیاروں کو آسمانوں کے ساتھ ساتھ کتابوں میں بھی چمکنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ جو ہر طالب علم کو بلندی، اونچائی اور چمک ودمک پر گامزن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مجموعہ خود کلامی قرآنی آیات، کربلائی اصطلاحات، سائنسی ایجادات اور انگریزی لفظیات سے مزین ہے۔ان تمام خوبیوں کے باوجود خود کلامی کے اسلوب اور لفظیات میں دیگر مجموعوں کے مقابلے میں روکھا پن پایا جاتا ہے لیکن اس میں پھیکا پن یا باولا پن نہیں ہے۔ بلکہ سنجیدگی اور شرافت ہے جس کے متعلق نجمہ رحمانی لکھتی ہیں۔

''خود کلامی میں انہوں نے اپنا مطمع نظر کافی وسیع کیا ہے۔موضوعات کے اعتبار سے اور زبان واسلوب کے لحاظ سے بھی اس میں کافی تبدیلیاں محسوس ہوتی ہیں۔اب ان کے سامنے صرف اپنی ذات یا سماج کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ان کی فکر اس عورت تک پہنچ گئی ہے۔ جو آج کی مصروف زندگی میں جینے کے لیے گھر کے باہر قدم نکال چکی ہے دراصل یہ عورت گھر اور دفتر کے درمیان اس طرح بٹ گئی ہے کہ نہ تو خاندان کو مطمئن کر پاتی ہے اور نہ گھر کے باہر دوسرے لوگوں کو۔ اپنی انا اور خودداری کو رہن رکھنے کے باوجود تحقیر آمیز نظروں کا سامنا کرنا اس کی قسمت ہے۔'' (٦٧)

شجر، جنگل اور رنگ خود کلامی کی شاعری کا خاص استعارہ ہے۔شجر کو اس نے ذاتی اور سماجی دونوں حوالوں سے استعمال کیا ہے۔اسی طرح جنگل کا استعارہ بھی ہے جس کی نوعیت اجتماعی بھی ہے اور ذاتی بھی۔ جو ان کو ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے اور اگر وہ اعتماد اور وثوق کے ساتھ بھی طلسماتی دنیا کو خیر آباد کہتی ہیں تو یہ بے برگ وثمر شجر اور بھیڑیوں سے بھرے ہوئے جنگل ان کے ثابت قدم کو

ضمیر کی آواز پر واپس نہیں آنے دیتے۔ اس کیفیت کو وہ رنگوں کی زبان میں بھی بیان کرتی ہیں۔ جو انسانی نفسیات کی مختلف کیفیات کو پیش کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر رنگوں کی لفظیات کا رشتہ موسم بہار اور خزاں کے رشتوں کی حقیقت بیان کرتا ہے۔ جنگل کی وحشت، شجر کی ویرانی، رنگوں کا فریب اور بھیڑیے کی ہوس، نسائی زندگی کی آزادی کو غارت کر دیتی ہے اور انہیں چیزوں کا خوف دلا کر ان کو چہار دیواری میں قید رکھا جاتا ہے، جو بظاہر ان کا تحفظ ہے لیکن بباطن ان کی غلامی ہے جس میں وہ آج بھی قید ہیں اور خوش ہیں۔

باب ششم

مجموعۂ کلام
"انکار"
کا تنقیدی جائزہ

آرزوؤں کی مہارانی تمناؤں کی آواز اور خوشبوؤں کی شاعرہ پروین شاکر انکار تک آتے آتے ایک دھکہ کی آواز غموں کی پیامبر اور موت کی داعی بن گئی۔ اس نے خود کلامی میں طویل خود کلامی کے بعد یکسر انکار سماجی روایات سے آئینی تحفظات سے اور نسائی رسومات سے گزشتہ زندگی کے خواب وخواہشات پر انہیں اعترافِ ندامت ہے لیکن ان کی جمالیاتی شاعری اس حقیقت پر پردہ ڈالے ہوئے ہے ورنہ انکار کی شاعری میں صرف غم، مصیبت، ناامیدی اور مایوسی ہے چاہے وہ کوئی بھی کردار ہو۔ ماں کے کردار میں بھی مایوسی حب الوطنی میں بھی کافی مایوسی سیاسی انکار بھی مایوسی اور نسائی تبلیغ تو آخری سانس لے رہی ہے وہ اس مجموعہ کلام کی پہلی ہی غزل میں یہ کہتی ہیں کہ!

سارے جہاں سے کٹ گئے کتنے اکیلے رہ گئے

کس نے کہا تھا عمر بھر غم سے نباہ کے لئے

اب آپ سوچیے کی بظاہر جس کے پاس سب کچھ تھا اور دیکھنے میں وہ بالکل آسودہ تھی آخر وہ یہ کیوں کہہ رہی ہے کہ عمر بھر غم سے نباہ بہت مشکل ہے۔ انکار کی دوسری غزل گیتانجلی کی منظوم داستان ہے۔ جہاں آخری سفر کی تیاری چل رہی اور اس تیاری کا دکھ نہیں بلکہ خوشی ہے جو تمام مصائب وآلام سے چھٹکارا دینے والی ہے اور اس زندگی کے چند دن بھی اس سرخوشی میں کٹ رہے ہیں۔ اندازِ بیان ملاحظہ ہو۔ چند اشعار!

بابِ حیرت سے مجھے اذنِ سفر ہونے کو ہے

تہنیت ای دل کہ اب دیوار و در ہونے کو ہے

موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے دل میں کیوں

کیا محبت سے بہت خالی یہ گھر ہونے کو ہے

گرد راہ بن کر کوئی حاصل سفر ہو گیا

خاک میں مل کر کوئی لعل و گہر ہونے کو ہے

گھر کا سارا راستہ اس سرخوشی میں کٹ گیا

اس کے اگلے موڑ کوئی ہم سفر ہونے کو ہے

اس طرح انکار کی غزلوں میں مسلسل زندگی سے انکار کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ زندگی کا رخ شہرِ نا آباد کی طرف جاری ہے۔ شعر دیکھیے!

بستیوں کی گونج پراسراری ہونے لگی

جیسے سناٹا پکارے شہر نا آباد کا

اس رخصتی پر ماتم نہیں بلکہ ایک سنجیدہ تسلی ہے کہ یہی بہتر ہے!

بس اتنی عمر تھی اس سرزمین دل پہ میری

پھر اس کے بعد اسے وہم و خواب ہونا تھا

پروین شاکر کی ظاہری شکل اور آسائشِ دنیا کو دیکھ کر لوگوں نے انہیں خوش و خرم سمجھا۔ ان کی ابتدائی شاعری اور نوخیزی تک ہی لوگوں کی نگاہوں کو رسائی حاصل ہے۔ ان کے باطن سے لوگ یکسر ناواقف ہی رہے جس کی شکایت وہ خود کرتی ہیں۔

اس نے دیکھا ہی نہیں ورنہ یہ آنکھ

دل کا احوال کہا کرتی ہے

دکھ ہوا کرتا ہے کچھ اور بیان

بات کچھ اور ہوا کرتی ہے

نسائی درد وجود کی بے ثباتی اور زندگی کی بے وقعتی پر بھی انہوں نے ماتم کیا ہے کہ جہاں انسان صرف مجبور ہے اور سر اٹھانے کی اگر کوشش کی تو کچل دیا جاتا ہے۔

کچلے گئے جب بھی سر اٹھایا

فٹ پاتھ کی ایسی گھاس تھے ہم

بال کھولنا ایک ماتم ہے ایک علامتِ زیاں ہے ایک منحوس خبر ہے لیکن اگر زندگی ہی بال کھول دے تو اس کی تلافی نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ اس عظیم نقصان کی بھرپائی کسی ایک شخص یا شخصیت کے بس کی بات نہیں کیونکہ یہ انسانی وجود کا خطرہ ہے۔

بیٹھی ہے بال کھولے ہوئے میرے پاس شب

آئی ہے کون شہر سے اتنی اداس شب

شاید کہ کل کی صبح قیامت ہی بن کے آئے

اتری ہے جسم و جان پر بن کر نراس شب

دنیا ایک مقتل ہے، قتل گاہ ہے جہاں ہر زبردست زیردست کو نیست و نابود کرنے میں محو ہے۔ ایسے میں اگر امن و سکون اور خیریت کی بات کوئی کرتا ہے تو اہل خرد چونک اٹھتے ہیں کہ یہ دیوانگی ہے کیونکہ حقیقت لوگوں کو معلوم ہے پروین شاکر اسکی طرف خوبصورت اشارہ کرتی ہیں۔

شب خیریت کا سن کر بدن سرد پڑ گیا

کس کو نہیں خبر کہ ہے بین السطور کیا

اور ایسے برے حالات میں صرف ماضی کی یاد اور خواب کی بیساکھی ہی منزل کی دوار تک پہنچا سکتی ہے۔

اب تو بس خواب کی بیساکھی پر چلنا ہوگا

مدتیں ہو گئیں اس آنکھ کو معذور رہوئے

زندگی کی حقیقت اور آخرت پر اگر عقیدہ پختہ ہو جائے تو صرف مجبور ہی نہیں بلکہ باشادہ اور سکندر بھی جلد از جلد آخرت کی طرف پلٹ پڑیں گے۔ شعر دیکھیے !

وزیر و شاہ بھی خس خانوں سے نکل آتے
اگر گمان میں انکارِ قبر آ جاتا ہے

جب محبوب پر وہ جان دیتی تھیں جن خواہشات پر قربان ہوتی تھیں اور ماضی کی جس زندگی پر وہ نازاں و شاداں تھیں انکار میں ان تمام چیزوں کی منکر ہیں انتہائی اعتماد کے ساتھ یہ کہتی ہیں کہ !

اس سے ملنا ہی نہیں دل میں تہیہ کر لیں
وہ خود آئے تو بہت سرد رویہ کر لیں
ایک ہی بار یہ گھر راکھ ہو، جاں تو چھوٹے
آگ کم ہو تو ہوا اور مہیّا کر لیں

حقیقت سے واقفیت کے بعد سبھی بھرم اور خواب و خیال ختم ہو جاتے اور زندگی کے پتے زرد ہونے لگتے ہیں کیونکہ شجر کو اپنی بے ثباتی اور فانی ہونے کا علم ہو جاتا ہے اور وہ حقیقی دنیا کا متلاشی ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت کو پروین شاکر اس انداز میں بیان کرتی ہیں۔

زرد ہوتا جا رہا ہے صحن دل کا ہر شجر
جس طرح اندر ہی اندر دکھ کوئی کھانے لگے

جب دوسری دنیا کی تیاری شروع ہو جائے اور اس دنیا کی خواہشیں دم توڑ دیں تو ایسی حالت میں دنیاوی چمک دمک بھی پھیکی پڑ جاتی ہے اور ثبات و سکون کا عقیدہ بھی متزلزل ہو جاتا ہے کیونکہ جس گھر کی بنیاد ہی ہل رہی ہو اس کو سہارا نہیں دیا جاتا ہے۔ شعر دیکھیے !

ستون کتنا سہارا ان کو دیتے

جو گھر بنیاد سے ہی ہل چکے تھے

بظاہر دنیا حسین ہے جہاں محبوب کا پیار ہے عہدوں کی جھنکار ہے، ہر طرف پزیرائی ہے لیکن حقیقی زندگی کا اس سے کوئی رشتہ نہیں اور یہ چیزیں نادان کو تو خوش وخرم رکھ سکتی ہیں لیکن اہلِ نظر کو فریب نہیں دے پاتیں۔ پروین اس کے بارے میں کہتی ہیں۔

آسائش دنیا کا فسوں اپنی جگہ ہے

اس سکھ میں مگر روح کے آزار بہت ہیں

اور دنیا رخصت ہونے تک یہ راز نہیں کھل پاتا کہ ہم شکاری تھے یا شکار، ہماری حقیقت کیا تھی اور زندگی کا مقصد کیا تھا۔

جاں سے گزر گئے مگر بھید نہیں کھلا کہ ہم

کس کی شکار گاہ تھے کس کے لیے ہدف ہوئے

دنیا کی حیثیت ایک ماتم کدہ کی ہے جہاں صرف آہ وبکا، گریہ ونوحہ ہے کیونکہ عزیز واقارب رخصت ہوتے چلے جاتے ہیں اور ہم صرف ماتم کرنے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ شعر دیکھیے۔

پھر سے خیمے جلے ہیں اور سرِ شام

بین ہے اپنے اپنے وارث کا

یہی رخصتی اور آخری منزل انسان کی ابدی زندگی ہے اور اس خاک کے لباس کو دیگر لباسوں پر فوقیت حاصل ہے۔ شعر دیکھیے۔

بزم انجم میں قبا خاک کی پہنی میں نے

اور مری ساری فضیلت اسی پوشاک میں ہے

شام ہونے تک سفر کے اعلان کا انتظار نہیں کیا جاتا بلکہ روانہ ہو جانے میں ہی عافیت اور دانشمندی ہے۔
شعر دیکھیے !

سرائے خانۂ دنیا میں شام ہوتی ہے
مسافروں کو نوید سفر نہیں آتی

اس مجموعۂ کلام انکار میں غزلوں کی طرح نظموں میں بھی ایک مایوسی، بے یقینی، افسردگی، پژمردگی اور راہ فرار کا علامتی کردار کارفرماں ہے۔ جہاں صرف جذبوں کی باوقار موت ہی ایک بہترین وسیلہ اور طریقہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظمیں مرثیے اور نوحہ سے قریب تر نظر آرہی ہیں جہاں صرف جدائی، درد، قربانی، انکساری، خودگریزی ہی قسمت نظر آرہی ہے۔ خوشی، مسرت، امید، خواہش اور خواب کا بھرم ٹوٹ چکا ہے گویا زندگی میں اب صرف پسپائی اور خوف ہی باقی بچا ہے جو زندگی کے ساتھ رخصت ہوگا باقی تمام چیزیں جا چکی ہیں۔

پروین شاکر یہاں سیاست سے بھی مایوس ہیں، معشیت سے بھی مایوس ہیں، عہدہ سے بھی مایوس ہیں یہاں تک کہ اپنی اولاد سے بھی مایوس ہیں کہ وہ جلد ہی سب کچھ چھوڑ کر چلا جائے گا اور میں پس منظر میں چلی جاؤں گی۔ اس طرح انکار پر مایوسی اور موت کا سایہ دکھائی دیتا ہے۔

پروین شاکر نے اس مجموعے میں جو شخصی نظمیں لکھی ہیں وہ پروین قادر آغا، فیض احمد فیض اور یاسر عرفات پر ہے۔ یاسر عرفات کی اس نظم میں ان کی شخصیت، قربانی، حب الوطنی، سادگی، صداقت اور انکساری کے جذبہ سے لبریز ہے جس میں انہوں نے اپنی پوری زندگی قربان کردی جن کے سر پر پوری زندگی چھت نصیب نہیں ہوئی اور انہوں نے آسمان کی وسعت کو ہی اپنی چھت مان کر خوش بھی رہے اور محوِ جنگ بھی رہے۔ جنہوں نے چلچلاتی ہوئی دھوپ برداشت کی لیکن غلامی کی دیوار کا سہارا نہیں لیا۔ جنہوں نے بارش اپنے ہاتھوں پہ روکی لیکن غلامی سے سمجھوتا نہیں کیا۔ پوری زندگی برف پر چلتے رہے لیکن علاوہ دل کے الاؤ کے اور کوئی آگ کسی سے نہیں

مانگی۔ ایک آزادی کے خواب کے لئے جس نے ساری عمر کی نیندیں گروی رکھ دیں۔ دھرتی سے آزادی کا وعدہ کیا اور پوری زندگی اس کے لئے لڑتا رہا اور خود باوقار نیند سو گیا۔ یہ نظم حب الوطنی اور آزادی کی بہترین مثال ہے۔

یاسر عرفات کے لئے ایک نظم

آسمان کا وہ حصہ

جسے ہم اپنے گھر کی کھڑکی سے دیکھتے ہیں

کتنا دلکش ہوتا ہے

زندگی پر یہ کھڑکی کی بھر تصرف

اپنے اندر کیسی ولایت رکھتا ہے

اس کا اندازہ

تجھ سے بڑھ کر کسے ہوگا

جس کے سر پہ ساری زندگی چھت نہیں پڑی

جس نے بارش سدا اپنے ہاتھوں پر روکی

اور دھوپ میں کبھی دیوار ادھار نہیں مانگی

اور برفوں میں

بس ایک الاؤ روشن کیا

اپنے دل کا

اور کیسا دل

جس نے ایک بار کسی سے محبت کی

اور پھر کسی اور جانب بھولے سے نہیں دیکھا

مٹی سے اک عہد کیا

اور آتش و آب و باد کا چہرہ بھول گیا

ایک اکیلے خواب کی خاطر

ساری عمر کی نیندیں گروی رکھ دی ہیں

دھرتی سے اک وعدہ کیا

اور ہستی بھول گیا

اور اس بھول پہ

سارے خزانوں جیسے حافظے واری

ایسی بے گھری، اس بے چادری کے آگے

سارے جگ کی ملکیت بھی تھوڑی ہے

آسماں کی نیلاہٹ بھی میلی ہے

پروین شاکر نے اس مجموعۂ کلام انکار میں اردو کے مشہور شاعر فیض احمد فیض پر دو نظمیں لکھیں ہیں ایک میں ان کی عظمت کا اعتراف ہے اور دوسری میں جانشین کا مسئلہ۔ اس نظم میں وہ فیض کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اِنہیں ماہتاب، فرش نیلوفری، روشنی اور نے نواز کے القاب سے نوازا ہے اور ان کے انتقال کو ادب کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ جس کے غم میں صرف شعراء، علماء، ادباء یا شرفاء ہی نہیں بلکہ فطرت کے مناظر بھی شامل سوگ ہیں۔

ہوائیں سیاہ پوش ہیں، شجر اور ٹہنی نے اپنے ہاتھوں سے پھولوں کو پھینک دیا ہے۔ بہاریں خزاں میں تبدیل ہو گئیں اور سخن کا شہر خاموش ہے اور سماعتیں چپ ہیں نظم بہت ہی پر درد، پر اثر اور پر وقار ہے جس میں جذبۂ عقیدت کارفرما ہے۔

فیض کے فراق میں

تہہ خاک

کیسا چراغ وقت نے رکھ دیا

کہ سیاہ پوش ہوئی ہوا

کفِ دست بادِ صبا سے پھول یہ کیا گرا

چمن نگاہ میں اب بہار کہیں نہیں

ہمہ شہر راہ میں اور نگار کہیں نہیں

پل سبز پر کوئی نجم راہ فروز اب نہیں خیمہ کس

وہ غبار اٹھا ہے کہ سوجھتا نہیں راستہ

مرے ماہتاب کہاں کہ تو

کوئی اور بھی ہے نظام مہر و نجوم جس کو رواں ہے تو

ترے فرش نیلوفری پہ کون سے بُرج کی یہ کشش بڑھی

کہ طلسم خانہ ہست میں تیری روشنی کا قیام اتنا لکھا گیا

میرے نے نواز

قبائے ساز ترے فراق میں چاک ہے

وہ سکوت شہر سخن میں ہے

کہ صدائے گریہ شبنم شب تار دل کو سنائی دے

تہہ ہفت حجلہ نور ایک ہی خواب ہے

کوئی معجزہ ہو کہ شکل تیری دکھائی دے!

کوئی سلسلہ ہو کہ راہ پھر سے سُجھائی دے!

پروین شاکر اپنی دوست، سرپرست، اور ساتھی پروین قادر آغا سے بہت متاثر تھیں انکار کو ان کے ہی نام معنون بھی کیا۔ اس نظم میں پروین شاکر پوری دنیا سے محروم ہو کر مصائب اور پریشانی میں گرفتار ہیں اور پروین قادر آغا نے انہیں ان تمام مصائب اور مسائل سے نجات دلایا۔ جس کا اعتراف وہ خود کرتی ہیں اور ان کو فرشتہ قرار دیتی ہیں نظم دیکھئے۔

پروین قادر آغا

جب میرے سر سے چادر اتری
تو میرے گھر کی چھت میرے لیے اجنبی ہوگئی
''تم ہمارے لیے مرچکی ہو''
اہل خانہ کی خاموشی نے اعلان کیا
اور میں بابُل کے دروازے سے
دستک دیے بنا
لوٹ آئی
میں نے
(بڑے مان سے)
اپنے پریمی کی طرف دیکھا
مگراس کی آنکھوں میں برف جم چکی تھی
(جیسے میرے لیےان جھیلوں میں کنول بھی کھلے ہی نہ تھے)

اب میں کھلے آسمان تلے کھڑی تھی

اپنے لال کو سینے سے لگائے

یا اللہ! میں کہاں جاؤں

سر پہ پہاڑی رات

چاروں طرف بھیڑیے

اور عورت بو سونگھتے ہوئے شکاری کتّے

''ہمیں گھاس نہ ڈالنے کا نتیجہ'' کہتی آنکھیں

''ہمیں موقع دو'' کہنے والے اشارے

اور چیتھڑے اڑانے والے قہقہے

اور مار دینے والی ہنسی

ٹھٹھے کرتی ہوا

اور فقرے کستی بارش

ہر طرف سے سنگباری

مجھ میں اور پاگل پن میں

بس ایک رات فاصلہ رہ گیا تھا

خودکشی بھی میری تاک میں بیٹھی تھی

قریب تھا کہ

میں اس کے ہاتھ آجاتی

کہ ایک سایہ میری طرف بڑھا

اور میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا

"ہمیں کسی کی پرواہ نہیں

تم جیسی بھی ہو ہمیں عزیز ہو"

اس دن

میں اتنا روئی

کہ دنیا اگر ایک خالی تالی ہوتی

تو میرے آنسوؤں سے بھر جاتی

میرا ملامت بھرا وجود

اس دن سے آج تک

اُس مہربان سایے کی پناہ میں

خدا

کبھی کبھی

اپنے فرشتوں کو

زمین پر بھی بھیج دیتا ہے!

پروین شاکر نے فیض پر یہ جو دوسری نظم لکھی ہے یہ دراصل ایک شخصی مرثیہ ہے جس میں اس عظیم شاعر کے رخصت ہوتے ہی جانشینی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے اور ہر شخص ان کے نام کو بھنانا چاہتا ہے اپنے اپنے انداز اور کرامات سے۔ نظم بہت ہی دلچسپ اور عبرتناک ہے۔

فیض صاحب کے لیے ایک اور نظم

عجب گھڑی ہے

ابھی تجھے سبز خانۂ خاک میں رکھے

اک پہر ہوا ہے

ابھی قبائے سخن سے

تیرے بدن کی گرمی گئی نہیں ہے

فرودگاہِ حیات میں رخصتِ سفر کی

تمام تر گو ددم بخود ہے

نشست کی جا نہیں ملی ہے

تیری لحد کے گلاب ویسے ہی تازہ رو ہیں

صبا ابھی تیری مسکراہٹ سے مشکبو ہے

ابھی تو رسم وداع پوری نہیں ہوئی تھی

کہ جانشینی کا مسئلہ چھڑ گیا ہے ہم میں

کسی کا کہنا کہ خرقۂ فن

اسے تیرے ہاتھ سے ملا ہے

کوئی بزعمِ خود آن کر

مسندِ خلافت پہ رونق افروز ہو گیا ہے

مجاورینِ ادب، تیرے مقبرے پہ

لوبان و عود عنبر جلائے بیٹھے

سخن کا نذرانہ مانگتے ہیں

اک اک غزل کہنے والے نوخیز و سبز رو کو دکانِ شہر سخن کو

آ کر بصد عنایت

بقا کی تعویذ بانٹتے ہیں

کہیں ترا نام بک رہا ہے

کہیں پہ آواز کا ہے سودا

سخن کی آڑھت عروج پر ہے

نظم ندامت ایک اعتراف ندامت ہے خوش فہمی، خوش گوئی اور خوش کلامی کا جس نے حقیقت کو نہ جانتے ہوئے صرف وہم و خواب اور خواہشات کا ذکر کیا دنیا کے حسن کو دیکھا اور اذیت کو نہ سمجھا پروین شاکر نے اپنی گزشتہ زندگی اور گزشتہ شاعری جس پر خوشبو اور صد برگ کا لیبل لگا ہوا ہے سے انکار کی شکل میں انکار کرتی ہیں۔

وہ کہتی ہیں کہ دنیا بظاہر جتنی خوش رنگ ہے اس کا حقیقی چہرہ اتنا ہی بدرنگ ہے۔ پروین شاکر کہتی ہیں کہ!

''میں خود کو خوشبوؤں کی شاعرہ سمجھ کر خوش ہوتی تھی کیوں کہ میں حقیقت سے ناواقف تھی میری آنکھوں کو سچائی تک رسائی نہیں تھی دیا اور سماج کا بدترین چہرہ میری نگاہوں سے اوجھل تھا وہ بچوں کو تازہ گلاب اور کیک کو روٹی کا متبادل سمجھتی رہی میں نے اینٹ کی تکیا لگا کر سوتا ہوا راجکمار اور کوڑے کے ڈھیر پر کھلتا ہوا گلاب نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے اب میں حقیقت آشنا ہوں اور اگر ہو سکے تو میرے بچے مجھے معاف کر دینا پروین شاکر کے انکار کی شاعری میں سعدی کے تجربات اور پریم چند کے مشاہدات یکجا نظر آتے ہیں جس نے ان کی شاعری کو جاویداں کر دیا ہے۔ نظم ندامت دیکھیے۔

ندامت

میری تمام نظموں کا انتساب اب تک صرف میرے اپنے نام رہا

اور میں خود کو محبت کی شاعرہ سمجھ کر

خوش ہوتی رہی

میں نے کوڑے کے ڈھیر پر بلی کی طرح چلتا ہوا بچہ نہیں دیکھا

میں نے اینٹ کا تکیہ بنا کر سوتا ہوا راج نہیں دیکھا

راج سے میرے ذہن میں

ہمیشہ راج ہنس آئے

اور بچوں سے تازہ گلاب

میں کیک کو روٹی کا متبادل سمجھتی رہی

میرے بچے

میرے راج

ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا!

دنیا کی تمام تہذیبوں میں عورت کی حالت بدترین ہے۔ کسی نے ان کو زندہ در گور کیا تو کسی نے انہیں اس قابل بھی نہیں سمجھا اور جانور سے بھی بری زندگی گزار رہی ہیں خواہ وہ باپ کے گھر رہیں، شوہر کے گھر رہیں یا جانوروں کے ساتھ رہیں، ان کی حالت اور لینت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ان کو دودھ دینے والے جانوروں میں بھی کم اوقات سمجھا جاتا ہے اور اس کی وفاداری ہمیشہ مشکوک رہتی۔ پوری زندگی وہ خدمات گار کی شکل میں گزارتی ہیں جس کی کوئی تنخواہ نہیں کوئی چھٹی نہیں اور کوئی خوشی نہیں صرف کام اور صلح میں بدنام اور پھر افزائش نسل کا ذمہ۔ پوری نظم ایک طنزیہ انداز میں ہے جو باعث نصیحت اور قابل عبرت ہے۔

بشیر کے گھر والی

ہے رے تیری کیا اوقات!

دودھ پلانے والے جانوروں میں

اے سب سے کم اوقات

پُرش کی پنسلی سے تو تیرا جنم ہوا

اور ہمیشہ پیروں میں تو پہنی گئی

جب ماں جایا پھلواری میں تتلی ہوتا

تیرے پھول سے ہاتھوں میں

تیرے قد سے بڑی جھاڑ ہوتی

ماں کا آنچل پکڑے پکڑے

تجھ کو کتنے کام آجاتے

اُپلے تھاپنا

لکڑی کاٹنا

گائے کی سانی بنانا

پھر بھی مکھن کی ٹکیہ

ماں نے ہمیشہ بھیّا کی روٹی پہ رکھی

تیرے لیے بس رات کی روٹی

رات کا سالن

روکھی سوکھی کھاتے

موٹا جھوٹا پہنتے

تجھ پہ جوانی آئی تو

تیرے باپ کی نفرت تجھ سے اور بڑھی

تیرے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے پر

ایسی کڑی نظر رکھیں

جیسے ذرا سی چوک ہوئی

اور تو بھاگ گئی

سولھواں لگتے ہی

ایک مرد نے اپنے مَن کا بوجھ

دوسرے مرد کے تن پر اتار دیا

بس گھر اور مالک بولا

تیری چاکری وہی رہی

بلکہ کچھ اور زیادہ

اب تیرے ذمے شامل تھا

روٹی کھلانے والے کو

رات گئے خوش بھی کرنا

اور ہر ساون گابھن ہونا

پورے دنوں سے گھر کا کام سنبھالتی

پتی کا ساتھ

بس بستر تک

آگے تیرا کام!

کیسی نوکری ہے

جس میں کوئی دیہاڑی نہیں

جس میں کوئی چھٹی نہیں

جس میں الگ ہو جانے کی، سرے سے کوئی ریت نہیں

ڈھوروں ڈنگروں کو بھی

جیٹھ اساڑھ کی دھوپ میں

پیڑ تلے ستانے کی آزادی ہوتی ہے

تیرے بھاگ میں ایسا کوئی سمے نہیں

تیرے جیون پگڈنڈی پر کوئی پیڑ نہیں ہے

ہے رے،

کن کرموں کا پھل ہے تو

تن بیچے تو کسبی ٹھہرے

مَن کا سودا کرے اور پتنی کہلائے

سمے کے ہاتھوں ہوتا رہے گا

کب تک یہ اپمان

ایک نوالہ روٹی،

ایک کٹورے پانی کی خاطر

دیتی رہے گی کب تک تو بلیدان

یہ ایک طنزیہ نثری نظم ہے جس میں تعلیم یافتہ حضرات کی محدود ذہنیت، بے راہ روی اور خاص کر ادباء وشعراء کی اخلاقی پستی پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ جن میں قربانی کا جذبہ ہونا چاہیے جو صرف اس زمین کی ہی نہیں بلکہ کائنات کے ذرہ ذرہ پر ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف برسرِ پیکار رہتے وہ آج صرف اپنی جنسی خواہشات اور دنیاوی لوازمات تک محدود رہ گئے ہیں۔ باقی دنیا سے انہیں کچھ بھی سروکار نہیں اس نظم کا مرکزی کردار ایک شاعر ہے جس کا نام ''سارا'' ہے۔ جس کی جھوٹی تعریف کر کے اس کو دنیا کی مشہور شاعرہ قرار دیکر اس کا ذہنی اور جنسی استحصال کیا جاتا ہے اور صرف اس کی زندگی تک ہی نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی اس کے نام سے لذت ملتی ہے اس شاعرہ کے پس منظر میں پروین شاکر نے نسائیت کے استحصال کی طرف اشارہ کیا ہے جو کسی بھی تہذیب میں محفوظ نہیں رہ پاتی خواہ تعلیم یافتہ سماج ہو یا جاہل، پوری نظم پیش کی جارہی ہے۔

ٹماٹو کیچپ

ہمارے ہاں

شعر کہنے والی عورت کا شمار عجائبات میں ہوتا ہے

ہر مرد خود کو اس کا مخاطب سمجھتا ہے

اور چونکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا

اس لیے اس کا دشمن ہو جاتا ہے!

سارا نے ان معنوں میں

دشمن کم بنانے

اس لیے کہ وہ وضاحتیں دینے میں

یقین نہیں رکھتی تھی

وہ ادیب کی جورو بننے سے قبل ہی

سب کی بھابھی بن چکی تھی

ایک سے ایک گئے گزرے لکھنے والے کا دعویٰ تھا

کہ وہ اس کے ساتھ سو چکی ہے

صبح سے شام تک

شہر بھر کے بے روزگار ادیب

اس پر بھنبھناتے رہتے

جو کام کاج سے لگے ہوئے تھے

وہ بھی

سڑی بُسی فائلوں اور بوسیدہ بیویوں اوب کر

ادھر ہی آتے

(بجلی کے بل، بچے کی فیس اور بیوی کی دوا سے بے نیاز ہو کر

اس لیے یہ مسائل

چھوٹے لوگوں کے سوچنے کے ہیں)

سارا دن

ساری شام

اور رات کے کچھ حصے تک

ادب اور فلسفے پر دھواں دھار گفتگو ہوتی

بھوک لگتی تو

چندہ وندہ کر کے

نکّڑ کے ہوٹل سے روٹی چھولے آجاتے

عظیم دانشور

اس سے چائے کی فرمائش کرتے ہوئے کہتے

تم پاکستان کی امرتا پریتم ہو

بے وقوف لڑکی

سچ سمجھ لیتی

شاید اس لیے بھی

کہ اس کے نان ونفقہ کے ذمہ دار تو اسے ہمیشہ

کافکا کی کافی پلانے

اور نرودا کے بسکٹ کھلاتے رہتے

اس رال میں لتھڑے ہوئے COMPLIMENT کے بہانے

اسے روٹی تو ملتی رہی

لیکن کب تک

ایک نہ ایک دن تو اسے بھیڑیوں کی چنگل سے نکلنا ہی تھا

سارا نے جنگل ہی چھوڑ دیا!

جب تک وہ زندہ رہی

ادب کے رسیا اسے بھنبھوڑتے رہے

ان کی محفلوں میں اس کا نام

اب لذیذ سمجھا جاتا ہے

بس یہ کہ اب وہ اس پر دانت نہیں گاڑ سکتے

مرنے کے بعد انہوں نے اسے

ٹماٹو کیچپ کا درجہ دے دیا ہے!

یہ نظم انسانی حقوق کی بدترین پامالی کا منظر پیش کر رہی ہے جو اس ترقی یافتہ تہذیب اور ترقی یافتہ ملک کے منھ پر پرایک طمانچہ ہے ایک اہم اور مشکل سوال ہے چھوٹی سی یہ نظم اپنے آنچل میں بڑا درد لیے ہوئے ہے۔ نظم دیکھیے۔

ایک مشکل سوال

ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے سے

ایک بارہ تیرہ سالہ چہرہ جھانکا

وہ چہرہ

بہار کے پہلے پھول کی طرح تازہ تھا

اور آنکھیں

پہلی محبت کی طرح شفّاف!

لیکن اس کے ہاتھ میں

ترکاری کاٹتے رہنے کی لکیریں تھیں

اور ان لکیروں میں

برتن مانجھنے والی راکھ جمی تھی

اس کے ہاتھ

اس کے چہرے سے بیس سال بڑے تھے!

پروین شاکر اپنی اس نظم میں مرد کی ذہنیت اور اس کے ظاہری عشق پر طنز کرتی ہیں کہ وہ صرف عورتوں کو تسکین کی حد تک ہی چاہتے ہیں اور باقی سب کچھ فریب ہے۔ جو لوگ اس سے زیادہ چاہتے ہیں وہ بیوقوف تصور کیے جاتے ہیں اور جلد ہی انہیں بھی اپنی بیوقوفی یا کم ظرفی کا اعتراف ہو جاتا ہے اور وہ خود کہتے ہیں کہ کسی ایک شخص سے جدا ہونے پر دنیا کی تمام رونق ختم نہیں ہوتی بلکہ مزید رونقوں میں اضافہ ہو جاتا ہے، اگر آنکھیں کھلی رکھی جائیں۔ اس نظم میں اسی کیفیت پر پروین شاکر نے خوبصورت طنز کیا ہے۔ نظم دیکھیے !

سمجھداری کی ایک نظم

باسو بہت رویا

اور مصر رہا کہ اسے اس کی زوجہ کے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے

نوجوانوں نے ایک دوسرے کو

آنکھوں ہی آنکھوں میں کہنیاں مار دیں

بوڑھوں نے اسے خلل دماغ کیا

اور مولوی نے بدعت

باسو بڑی مشکل سے گھر لایا گیا؟

وہ روز دفتر سے سیدھا میوہ شاہ چلا جاتا

پھولوں اور اگربتّیوں کے ساتھ

اس کا کافی عرصے یہی معمول رہا

پھر جمعرات کے جمعرات

پھر ہر نوچندی کو

پھر عید، بقر عید اور شبِ برات

آخر میں برسی کے برسی

ایک دن چلچلاتی دھوپ میں

بس نمبر ٦۰ سے اترتے ہوئے

اس کی نظر ایک پیڑ پر پڑی

تو اسے دفتر میں رکھی گئی

نئی ٹائپسٹ کا خیال آ گیا

اس دن اسے احساس ہوا

کہ دنیا ایک آدمی پر مشتمل نہیں ہے

یا سو بہت ہنسا

پروین شاکر کی یہ نظم اپنے آنچل میں زندگی کا وسیع تر پیغام رکھتی ہے۔ جہاں زندگی صرف مادی خوشحالی، جنسی آزادی، عہدہ کی سرفرازی اور جسمانی آسائش کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک پیغام انسانیت ہے جہاں آراستہ و پیراستہ گھر اور زندگی کی چمک دمک حقیقی نہیں بلکہ ان تمام چیزوں میں بے ثباتی پائی جاتی ہے۔ مسلسل زوال کے خطرات لاحق رہتے ہیں اور یہی خطرات زندگی اور شخصیت کو خوف زدہ کیے رہتے ہیں۔

اس لیے جب تک باطن آسودہ نہیں ہوتا اور روح سیراب نہیں ہوتی تب تک زندگی کو اور کاروانِ حیات کو سکون میسر نہیں ہوسکتا ہے اور یہ حاصل کرنے کے لیے اعتدال، اعتماد، انصاف اور انسانیت کی ضرورت ہے اور آج کے یگ میں یہی چیزیں اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں یہی وہ آواز ہے جو زیرِ زمین سے انسان کے ضمیر کو پکار رہی ہے۔ نظم دیکھیے۔

﴿ایک دفنائی ہوئی آواز﴾

پھولوں اور کتابوں سے آراستہ گھر ہے

تن کی ہر آسائش دینے والا ساتھی

آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچانے والا بچہ

لیکن اس آسائش، اس ٹھنڈک کے رنگ محل میں

جہاں کہیں جاتی ہوں

بنیادوں میں بے حد گہری چنی ہوئی

اک آواز برابر گریہ کرتی ہے

مجھے نکالو!

مجھے نکالو!

اس نظم میں پروین شاکر نے عورت کی بسی بے وقعتی اور کسمپرسی کی طرف اشارہ کیا ہے جہاں عورت کسی بھی صورت میں محفوظ نہیں اور یہ خطرہ کسی غیر سے نہیں بلکہ رہبر سے ہے جو رہزنی کی تاک میں بیٹھا ہے۔ طرح طرح کے جال لے کر جس میں دانہ و دام بھی ہے سنگ الزام بھی ہے جاہ و انعام بھی ہے۔ یعنی کسی بھی صورت میں وہ رسائی چاہتے ہیں تاکہ ہمدرد بنکر استحصال کیا جائے۔ ایسی حالت یا کیفیت میں صرف اولاد ہی ہے جو ماں کی حفاظت کرسکتی ہے۔ یہ اولاد آگ کی مانند ہے جس کے قریب آنے پر جلنے کا خطرہ ہے اور بھیڑ یا صفت انسان اس آگ سے بہت دور رہتے ہیں اس لیے وہ مراد کے وجود کو تحفظ کا حصار تصور کرتی ہیں۔ نظم دیکھیے !

مراد

بھیڑیے!

میرے چاروں طرف بھیڑیے

آنکھیں، حلقوں سے باہر

زبانیں بھی نکلی ہوئی

دھونکنی کی طرح سانس چلتی ہوئی

میرے اطراف حلقہ کیے

مری ایک لمحے کی غفلت کے یوں منتظر

جس طرح کوئی ماہر شکاری

دانہ و دام بھی

جاہ و انعام بھی

جاں حاضر ہے ہر شکل کا!

پر مرے گرد

ایسا الاؤ وہ روشن

کہ ہر حیلہ و مکر کے باوجود

یہ درندے

فاصلے کو نبھانے پہ مجبور ہیں

بھیڑیے آگ میں پاؤں رکھتے نہیں

پروین شاکر انتہائی صفائی پسند اور نفاست پسند تھیں۔ ان کا گھر ہمیشہ مہمانوں کے لیے آراستہ و پیراستہ رہتا تھا لیکن مراد ان تمام چیزوں کو بکھیر کر رکھ دیتا تھا اور کوئی بھی چیز نہ صاف رہتی تھی اور نہ ترتیب سے لیکن ان سب کے باوجود مراد ہی ان کے گھر کی سب سے بڑی رونق تھی جس کے وجود نے ان کی زندگی کو منور کر رکھا تھا مراد کی یہ تمام حرکتیں انہیں پیاری لگتی تھیں کیوں کہ مراد ان کی عزیز ترین شے تھی۔ جس کے بغیر ان کی دنیا تاریک تر تھی نظم کا عنوان اور نظم پیش خدمت ہے۔

شرارت سے بھری آنکھیں

ستاروں کی طرح سے جگمگاتی ہیں
شرارت سے بھری آنکھیں

میرے گھر میں اجالا بھر گیا
تیری ہنسی کا
یہ ننھے ہاتھ جو گھر کی کوئی شئی
اب کسی ترتیب میں رہنے نہیں دیتے
کوئی سامان آرائش نہیں، اپنی جگہ پر اب
کوئی کیاری سلامت ہے
نہ کوئی پھول باقی
یہ مٹی میں سنے پاؤں
جو میری خواب گہ کی دودھیا چادر کا ایسا حال کرتے ہیں
کہ کچھ لمحے گزرنے پر ہی پہچانی نہیں جاتی
مگر میری جبیں پر بل نہیں آتا

کبھی رنگوں کی پچکاری سے

سرتاپا بھگو دینا

کبھی چنری چھپا دینا

کبھی آنا عقب سے

اور مری آنکھوں پہ دونوں ہاتھ رکھ کر

پوچھنا تیرا

بھلا میں کون ہوں

بوجھیں تو جانوں!

میں تجھ سے کیا کہوں

تو کون ہے میرا

میرے نٹ کھٹ کنہیّا!

مجھے تو علم ہے اتنا

کہ یہ بے نظم اور ناصاف گھر

میرے توازن گر طبیعت پر

گراں بننے نہیں پاتا

اگر تو میرے آنگن میں نہ ہوتا

تو میرے خانۂ آئینہ ساماں میں

بہ ایں ترتیب و آرائش

اندھیرا ہی رہا کرتا!

ماں کا کردار جو انتہائی مقدس اور بلند ترین مرتبہ ہوتا اور ہر عورت کا یہ خواب ہوتا ہے کہ ماں بنے تا کہ زندگی مکمل ہو اور روح آسودہ۔ لیکن پروین شاکر کی حساس طبیعت اس کردار میں بھی کبھی کبھی مایوس نظر آتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ ماں کی قسمت میں ہی جدائی لکھی ہوئی ہے وہ کسی بھی طرح اولاد کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہ پاتی کیوں کہ وہ جس کی ماں اس کی بھی ایک زندگی ہے ایک دل ہے۔ ایک عمر ہے اور ایک مستقبل ہے اور وہ اولاد بھی ان سبھی چیزوں کی تلاش میں سرگرداں رہے گا جہاں اس کا ساتھی اس کے ہمجولی اس سے قریب تر ہو جائیں گے اور ماں پس منظر میں چلی جائے گی اور ایک دن تنہا ہو جائے گی۔ نظم دیکھیے!

سفر اب جتنا باقی ہے

بہت سردی ہے....... مما
ابھی کچھ دیر
میرا ہاتھ مت چھوڑیں!

زمستاں کی ہوا سے کپکپاتا
میرے سینے سے لگا
تو کہہ رہا تھا!

زیادہ دن نہیں گزرے
کہ میری گود کی گرمی
تجھے آرام دیتی تھی
گلے میں میرے، بانہیں ڈال کر تو اس طرح سوتا

کہ اکثر ساری ساری رات میری

ایک کروٹ میں گزر جاتی!

میرے دامن کو پکڑے

گھر میں تتلی کی طرح گھومتا پھرتا

مگر پھر جلد ہی تجھ کو پرندوں اور پھولوں

اور پھر ہمجولیوں کے پاس سے ایسا بلاوا آ گیا کہ

میری انگلی چھڑا کر

تو ہجوم رنگ میں خوشبو کی صورت مل گیا

پھر اس کے بعد

خوابوں سے بھرا بستہ لیے

اسکول کی جانب روانہ ہو گیا تو

جہاں پر رنگ اور پر حرف اور پھر ہند سے

اور سو طرح کے کھیل تیرے منتظر تھے

دل لبھاتے تھے

تیرے استاد مجھ سے معتبر تھے

دوست مجھ سے خوب تر تھے

مجھے معلوم ہے

میں تجھ سے پیچھے رہ گئی ہوں

سفر اب جتنا باقی ہے

وہ بس پسپائی کا ہی رہ گیا ہے

تیری دنیا میں اب ہر پل

نئے لوگوں کی آمد ہے

میں بے حد خامشی سے

ان کی جگہیں خالی کرتی جا رہی ہوں

ترا چہرہ بکھرتا جا رہا ہے

میں بس منظر میں ہوتی جا رہی ہوں!

زیادہ دن نہ گزریں گے

میرے ہاتھوں کی یہ دھیمی حرارت

تجھے کافی نہیں ہوگی

کوئی خوش لمس دست یاسمیں آ کر

گلابی رنگ حدّت

تیرے ہاتھوں میں سمو دیگا

میرا دل تجھ کو کھو دے گا

میں باقی عمر

تیرا راستہ تکتی رہوں گی

میں ماں ہوں

اور مری قسمت جدائی ہے

پروین کے بیٹے مراد نے جب پہلی بار قلم اٹھایا اور ماں سے پوچھتا ہے کہ! میں کیا لکھوں مما؟ تو پروین شاکر کو اپنا تخلیقی لمحہ یاد آ گیا اور وہ محبت سچائی اور نیکی کا ورثہ اسے منتقل کرتی ہیں جو اپنے باپ دادا سے پروین شاکر نے پایا تھا۔ اس وصیت اور نصیحت کے ساتھ کہ سب کچھ کرنا مگر آنکھیں کھلی رکھنا پوری نظم اس طرح ہے۔

اپنے بیٹے کے لیے ایک نظم

میرے بچے نے پہلی بار اٹھایا ہے قلم

اور پوچھتا ہے

کیا لکھوں مما؟

میں تجھ سے کیا کہوں بیٹے

کہ اب سے برسوں پہلے

یہ لمحہ جب مری ہستی میں آیا تھا

تو میرے باپ نے مجھ کو سکھائے تھے

محبت، نیکی اور سچائی کے کلمے

مرے توشے میں ان لفظوں کی روٹی رکھ کے وہ سمجھا تھا

میرا راستہ کٹ جائے گا

آگے سفر آسان ہو جائے گا شاید!

محبت مجھ سے دنیا نے وصولی

قرض کی مانند

نیکی سود کی صورت میں

حاصل کی

مری سچّائی کے سکّے

ہوئے رد اس طرح سے

کہ میں فوراً سنبھلنے کے نہ گر تدبیر کرتی

تو سر پہ چھت نہ رہتی

تن پہ پیراہن نہیں بچتا

میں اپنے گھر میں رہ کر

عمر بھر جزیہ ادا کرتی رہی ہوں!

میرے خدشوں سے سوا عیّار رہتا تھا

اور زندگی

میری توقع سے زیادہ بے مروّت تھی

تعلق کے گھنے جنگل میں

بچھو سرسراتے تھے

مگر ہم اس کو سرشاری میں

فصلِ گل کی سرگوشی سمجھتے تھے

پتہ ہی کچھ نہ چلتا تھا

کہ خوابوں کی چھپر کھٹ پر

لباسِ ریشمیں

کس وقت بن کر کیچلی اترا

مخاطب کے رو پہلے دانت
کب لمبے ہوئے
اور کان
کب پیچھے مڑے
اور پاؤں
کب غائب ہوئے یکدم!

میں اس کذب وریا
اس بے لحاظی سے بھری دنیا میں رہ کر
محبت اور نیکی اور سچائی کا ورثہ
تجھ کو کیسے منتقل کردوں
مجھے کیا رے دیا اس نے!

مگر ماں ہوں
اور اک ماں اگر مایوس ہو جائے
تو دنیا ختم ہو جائے
سو میرے خوش گماں بچّے!
تو اپنی لوحِ آئندہ پہ
سارے خوبصورت لفظ لکھنا
صدا سچ بولنا
احسان کرنا
پیار بھی کرنا
مگر آنکھیں کھلی رکھنا!

پروین شاکر کی اس نظم میں ماں اور اولاد کی محبت اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔ ماں اپنی اولاد سے کتنی محبت کرتی ہے اور اس کی جدائی کتنی اذیت ناک اور دردناک ہوتی ہے جب قوت گویائی بھی جواب دے جاتی ہے۔ صرف بستر ہی نہیں دل بھی خالی لگتا ہے۔ زندگی تشنہ اور روح تاریک ہوجاتی ہے کیونکہ ماں صرف ماں نہیں بلکہ ایک دوست اور ایک ہمجولی کی طرح بچے کے ساتھ گھل مل کر اس کا بھی دل بہلاتی ہے اور اپنا بھی۔ اولاد کی موجودگی میں نرم بدن کی گرمی، سانسوں کی گلابی خوشبو اور ننھے وجود کی حدت گردن میں حمائل باتیں ماں کے وجود کو تقویت دیتے ہیں۔ ماں کی شخصیت اور صلاحیت کو تقویت دیتے ہیں۔ اس لیے ماں ان کی جدائی پر خون کے آنسو روتی ہے اور اسے کسی بھی پل چین نہیں آتا یہ نظم انتہائی دردناک اور پر اثر ہے۔ نظم کا عنوان اور انداز ملاحظہ ہو!

جدائی کی پہلی رات

آنکھ بوجھل ہے
مگر نیند نہیں آتی ہے
میری گردن میں حمائل تری بانہیں جو نہیں
کسی کروٹ بھی مجھے چین نہیں پڑتا ہے
سرد پڑتی، سورات
مانگنے آئی ہے پھر مجھ سے
ترے نرم بدن کی گرمی
اور دریچوں سے جھجکتی ہوئی آہستہ ہوا

کھوجتی ہے مرے غم خانے میں

تیری سانسوں کی گلابی خوشبو!

میرا بستر ہی نہیں

دل بھی بہت خالی ہے

اک خلا ہے کہ مری روح میں دہشت کی طرح اترا ہے

تیرا ننھا سا وجود

کیسے اس نے مجھے رکھا تھا

تیرے ہوتے ہوئے دنیا سے تعلق کی ضرورت ہی نہ تھی

ساری وابستگیاں تجھ سے تھیں

تو مری سوچ بھی، تصویر بھی اور بولی بھی

میں تیری ماں بھی، تیری دوست بھی، ہم جولی بھی

تیرے جانے پہ کھلا

لفظ ہی کوئی مجھے یاد نہیں

بات کرنا ہی مجھے بھول گیا!

تو مری روح حصہ تھا

مرے چاروں طرف

چاند کی طرح رقصاں تھا مگر

کس قدر جلد تری ہستی نے

مرے اطراف میں سورج کی جگہ لے لی ہے

اب ترے گرد میں رقصندہ ہوں!

وقت کا فیصلہ تھا

تیرے فردا کی رفاقت کے لیے

میرا امروز اکیلا رہ جائے

مرے بچے، مرے لال

فرض تو مجھ کو نبھانا ہے مگر

دیکھ کہ کتنی اکیلی ہوں میں!

۶/دسمبر ۱۹۸۷ء کے لیے ایک دعا یہ نظم حب الوطنی پر مبنی ہے جس میں وہ خدا سے دعا گو ہیں کہ ان کے ملک کے محافظ آرام پرست زر پسند اور عہدوں کے طلبگار ہو گئے ہیں اور ایسی کیفیت میں ملک سلامت نہیں رہ سکتا کیونکہ دشمن تاک میں بیٹھا ہے۔ سیاست کی بازیگری نے ان کی تلواروں کو کند کر دیا ہے حب الوطنی کا جذبہ حب المال میں تبدیل ہو گیا اور وہ خواب و خیال میں گم رہتے ہیں۔ گرمی ٹھنڈک اور بارش سے بھی بچنے کی کوشش ہے جب کہ ایک محافظ ان چیزوں سے عوام کو بچاتا ہے اور سرحد پر ان کی ہی نہیں پورے ملک کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ لیکن ان کی نگاہیں اب صرف قیادت، سیاست اور تجارت پر وہ خوددار سے خودغرض ہو گئے ہیں اگرچہ ان کے جسم کی بناوٹ اور تندرستی ابھی برقرار ہے لیکن ان کی سوچ تبدیل ہو گئی اور یہ خودغرضی اور عشق احوال صرف انہیں ہی نہیں بلکہ پورے ملک کو غلام کر دے گا۔ جس پر پروین شاکر سخت پریشان ہیں اور خدا سے یہ دعا کرتی ہیں نظم دیکھیے۔

۶/ستمبر ۱۹۸۷ء کے لیے ایک دعا

اے خدا!

میرے پیارے سپاہی کی تلوار میں رنگ لگنے لگا ہے

اذانوں سے پہلے جو بیدار ہوتے تھے

اب دن چڑھے تک

چھپر کھٹ سے نیچے اترتے نہیں

دھوپ اگر سخت ہو جائے

بارش ذرا تیز ہو جائے تو

یہ جواں سال

گھر سے نکلتے نہیں

سرحدوں کے نگہبان اب کرسیوں کے طلبگار ہیں

اپنے آقا کے دربار میں

جنبش چشم و ابرو کی پیہم تلاوت میں مصروف ہیں

سر خمیدہ ہیں

شانے بھی آگے کو نکلے ہوئے

بس نصاب تملق کی تکمیل میں منہمک!

اے خدا!

میرے پیارے وطن پر یہ کیسی گھڑی ہے

تراشے ہوئے جسم

آسائشوں میں پڑے

اپنی رعنائیاں کھو رہے ہیں

ذہن کی ساری یکسوئی مفقود ہے

اہل طبل و علم

اہل جاہ وحشم بن رہے ہیں

اوراس بات پر

دیکھتی ہوں کہ مغرور ہیں!

اے خدا!

میرے پیارے سپاہی کو سرحد کا رستہ دکھا

عشق اموال وحُبِّ مناصب سے باہر نکال

اس کے ہاتھوں میں

بھولی ہوئی تیغ پھر سے تھما!

''بہت دل چاہتا ہے'' پروین شاکر کی ایک سیاسی اور وطن پرستی پر مبنی نظم ہے جس میں وطنِ عزیز سے محبت کا جذبہ اور اس سرزمین پر قابض حکمراں سے نفرت کا جذبہ کارفرماں ہے۔ جن کا کوئی معیار نہیں، کوئی آئین نہیں، کوئی دستور نہیں، کوئی قاعدہ نہیں، کوئی سلیقہ نہیں، جب کہ حملہ آور اور قاتل کا بھی ایک اصول ہوتا ہے، ایک نظام ہوتا ہے، ایک طریقہ ہوتا ہے، جس میں انسانیت اور حیوانیت کا فرق واضح رہتا ہے اور وہ صرف اپنے مقصد تک ہی تباہی و بربادی کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ مال و دولت حاصل کرتے ہیں اور جوانوں کو قتل کرتے ہیں لیکن ان بزدل حکمرانوں نے اس منصب کو چور دروازے سے حاصل کیا اور ظلم کی انتہا یہ کہ بیت المال ہی نہیں بیوہ کی پونجی بھی نہیں چھوڑی۔ بچوں کے کھلونے اور بچیوں کی مسکراہٹ تک چھین لی اور قلم کو تہ و بالا کر دیا سوچ اور فکر پر پہرہ بیٹھا دیا یہ نظم طنزیہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ایک تسلسل اور موسیقیت رکھتی ہے۔ نظم دیکھئے۔

''بہت دل چاہتا ہے''

بہت دل چاہتا ہے

کسی دن غاصبوں کے نام لکھّوں ایک کھلا خط

لکھوں اس میں

کہ تم نے چور دروازے سے آکر

مرے گھر کا تقدس

جس طرح پامال کر کے

توشہ خانے کو تصرف میں لیا ہے

تمہاری تربیت میں، یہ رویہّ

دشمنوں کے ساتھ بھی زیبا نہیں تھا!

کلامِ فتح میں بھی

یہ سخن شامل نہیں تھا!

یہاں تک بھی غنیمت تھا،

تمہارے پیش رو، بخت آزمائی میں

زر و سیم و جواہر تک نظر محدود رکھتے تھے

جوانوں کو تہِ تلوار کرتے

مگر ماؤں کی چادر

بیٹیوں کی مسکراہٹ

اور بچوں کے کھلونوں سے

تعرض کچھ نہ کرتے

مگر تم نے تو حد کر دی

نہ بیت المال ہی چھوڑا

نہ بیوہ کی جمع پونجی

اور اب تم نے

ہماری سوچ کو بھی

راجدھانی کا کوئی حصہ بنانے کا ارادہ کر لیا ہے

ہمارے خواب کی عصمت پہ نظریں ہیں!

قلم کا چھیننا
آساں نہیں ہے!
یہ درویشوں کی بستی ہے
دبے پاؤں بھی یاں آنے کی تم جرأت نہیں کرنا
کرائے پر
قصیدہ خواں اگر کچھ مل بھی جائیں تو
قبیلے کے کسی سردار کی بیعت نہیں ملنی
ہمارے آخری ساتھی کی تکمیلِ شہادت تک
تمہیں نصرت نہیں ملنی!

پروین شاکر ایک وطن پرست شاعرہ تھیں انہوں نے ملک پر قابض فوجی حکومت پر طنز کیا تھا کہ وہ محافظ ہیں۔حکومت چلانے کی استعداد اور صلاحیت ان میں شاید کم ہو جس پر انہیں نوٹس دیا گیا تھا۔ چیلینج اس نوٹس کے خلاف ایک ردِّ عمل ہے جس میں انہوں نے اپنی وفاداری اور فداکاری کا اظہار کرتے ہوئے وطن کی مٹی کی خوشبو اور وطن کے چہرے کو آنکھوں کے لئے راحت کہا۔ پروین شاکر نے مارشل لا کے وقت ہوئے ظلم و جبر اور حیوانی حرکات کا ذکر اپنی نظموں میں کیا اور کہا کہ راست گوئی وطن پرستی ہے فصل خزاں کو فصل خزاں کہنا گلشن سے غداری نہیں ہے بلکہ وطن پرستی کی دلیل ہے۔ پوری نظم طنز اور حب الوطنی سے سرشار ہے نظم دیکھیے۔

چیلینج

حاکم شہر کے ہرکارے نے

آدھی رات کے سنّاٹے میں

میرے گھر کے دروازے پر

دستک دی ہے

اور فرمان سنایا ہے

''آج کے بعد سے

ملک سے باہر جانے کے سب رستے، خود پر بند سمجھنا

تم نے غلط نظمیں لکھیں ہیں''

اے.ایس.آئی.سے کیا شکوہ

اس نے اپنا، ذہن کرائے پر دے رکھا ہے

وہ کیا جانے
مٹی کی خوشبو کیا ہے
ارضِ وطن کی راحت کیا ہے
حاکم وقت کی نظروں میں
میری وفاداری مشکوک ٹھہری تو
مجھ کو کچھ پرواہ نہیں
جس مٹی نے مجھ کو جنم دیا ہے
میرے اندر شعر کے پھول کھلائے ہیں
وہ اس خوشبو سے واقف ہے
اس کو خبر ہے
فصل خزاں کو فصل خزاں کہنے کا مطلب
گلشن سے غدّاری نہیں ہے
اور اگر ایسا ٹھہرا تو
حاکم وقت کے ہرکارے
مجھ پر فرد جرم لگائیں
خاکِ وطن کو حَکم بنائیں!

مجموعۂ کلام انکار اور پروین کے حساس ذہن کے متعلق ممتاز مفتی یوں لب کشا ہیں۔

''قدرت نے اس کے ذہن کو اس حد تک مسخر کر رکھا ہے کہ وہ اپنی تازہ تصنیف کا نام انکار رکھنے پر مجبور ہے۔'' (۶۸)

کفِ آئینہ

یہ پروین شاکر کا پانچواں اور آخری شعری مجموعہ ہے ان کے انتقال کے بعد جو بیاضیں دستیاب ہوئی تھیں وہ پروین قادر آغا کے پاس محفوظ تھیں۔ جس کو مظہرالاسلام نے ڈاکٹر توصیف تبسم اور امجد اسلام امجد کی مدد سے نسرین شاکر کے زیرِ نگرانی پروین شاکر کی دوسری برسی پر شائع کیا۔ پروین شاکر چونکہ اس عہد کی مقبول ترین شاعرہ تھیں اسی لیے مرتبین کی یہی کوشش رہی کہ جہاں تک ممکن ہو ان کے کلام کو محفوظ کرلیا جائے۔ اس لئے اس مجموعہ میں ان کی مختصر اور نا تمام غزلوں کے ساتھ ساتھ متفرق اشعار بھی شامل ہیں۔ اس میں غزلوں کی تعدادِ بتیس اور نظموں کی تعداد اکتیس ۳۱ ہے جس میں سولہ ۱۶ نظمیں عنوان سے اور پندرہ بغیر کسی عنوان کے ہیں۔

پروین شاکر کے اس شعری مجموعہ میں ایک خالی پن کا احساس ہے گویا یہ انکار کا آخری زینہ ہے جہاں نہ کوئی خواہش ہے نہ انبساط ہے اور نہ کوئی حسین خواب ہے اور نہ ہی تمناؤں کی سرکشی ہے بلکہ صرف اذیت اور خوف کی کیفیت ہے یعنی اس مجموعہ میں یتیمی کی کیفیت ظاہر ہے۔ غالباً پروین شاکر کو اپنی رخصتی کی خبر پہلے ہی ہو چکی جس کے پرتو اس مجموعہ کلام میں دیکھے جاسکتے ہیں، تبھی تو وہ کہتی ہیں کہ جہاں ہم ہیں وہاں آواز کو رستہ نہیں ملتا۔

باب ہفتم

اردو شاعرات میں "پروین شاکر" کا مرتبہ

اردو شاعری میں سب سے پہلا نام جس شاعرہ کا آتا ہے وہ شہزادی زیب النساء مخفی ہے جو اورنگزیب کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ عربی اور فارسی زبانوں میں بھی وہ شعر کہتی تھیں اور اردو میں بھی طبع آزمائی کرتی تھیں لیکن ان کا دیوان ناپید ہے اردو تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکرہ میں ان کے چند شعر جو درج کیے ہیں اب صرف وہی محفوظ ہیں باقی نایاب ہیں تذکرہ شاعرات اردو میں ان کے یہ تین اشعار درج ہیں۔

جدا ہوا مجھ سے میرا یار یہ خدا نہ کرے

خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے

کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی

پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

آ کر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے

خواب عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے

شاعرات اردو میں دوسرا مشہور نام میر تقی میر کی صاحبزادی بیگم کا ہے جس کی تصدیق تذکرۂ شمیم سخن، بہارستان ناز اور تذکرۂ خواتین کے مولّفین بھی کرتے ہیں ان کے اشعار میں میر کے رنگ اور آہنگ صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ شعر دیکھیے!

اتنا بھی غنیمت ہے تیری طرف سے ظالم

کھڑکی نہ رکھی روزنِ دیوار تو رکھا

ولی عہد شاہ عالم کی اہلیہ جینا بیگم بھی طبع آزمائی کرتی تھیں اوران کے بیشتر اشعار عشقیہ ہوا کرتے تھے ایک مثال کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔

آیا نہ کبھی خواب میں بھی وصل میسر

کیا جانیے کس ساعت بدآنکھ لگی تھی

بیگم کاملہ جعفری، جمعیت، پارسا، اختری، رسیا وغیرہ جیسی بہت سی شاعرات ملتی ہیں جن کا ذکر متعدد تذکرہ نگاروں نے کیا ہے لیکن ان کے دیوان یا مجموعہ یا مجموعہ کلام دستیاب نہیں ہو سکے جس سے ان کی شاعری اورشخصیت کے متعلق کچھ کہا جاسکے۔ یا تو لوگوں نے اسے اس لائق نہیں سمجھا یا زمانے کی بندش نے اسے اشاعت پزیر نہیں ہونے دیا جو بھی ہوا بہر حال وہ ایک بہترین کوشش تھی جو ابرو باد کے نذر ہوگئی اور اردو ادب اس پر ماتم کناں ہے۔

اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ چندا ماہ لقا حیدر آباد کی ایک مشہور طوائف تھی جو صاحب ثروت بھی تھی اور ماہر علوم وفنون بھی جس کی تصدیق تمام تذکرہ نگار کرتے ہیں۔ ان کے بعد شاعرات کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے لیکن دیوان غائب ہیں کیونکہ یہ عشقیہ شاعری تھی اوران کا تعلق کوٹھوں بالا خانوں اور مہمان خانوں تک ہی محدود رہا۔ شاعری ان سے اور وہ شاعری وشاعرہ سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

یہ شاعری اس وقت کی ہے جب مغلیہ حکومت زوال پزیر ہو چکی تھی اور ملک غلام ہو چکا تھا۔ جہاں آئین غلام ہو، ملک غلام ہو، زمین غلام ہو، مرد غلام ہو وہاں نسوانی آزادی ، اصلاحی شاعری اور صاحب دیوان شاعرات کی تلاش ایک مشکل امر ہے کیونکہ جب ملک ہی صاحب نصاب نہیں ہر طرف افراتفری، قتل وغارت گری اور خوں ریزی کا ماحول تھا، محل کھنڈر میں اور انسانیت حیوانیت میں تبدیل ہوتی جاتی تھی ، بے حیائی، بدچلنی اور فاقہ مستی عام ہو چکی تھی۔ اخلاقی پستی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ہر شخص راہ فرار اور وقتی قرار کی

تلاش میں تھا اس کیفیت کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

''اس دور میں ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی امراء اکابرین اور خود بادشاہ ساری معاشرتی و اخلاقی برائیوں میں ملوث تھے۔'' (۶۹)

غلام ہندوستان میں شاعرات کا غالب حصہ شاید ان بازاری کا ہی تھا لیکن جب ملک کی آزادی کی تحریک چلی تو شریف خواتین نے بھی اس تحریک میں حصہ لیا۔ جن میں دیگر فنون کے علاوہ شاعرات کا بھی سلسلہ ملتا ہے جن کے اشعار میں للکار، گرج، شور، حب الوطنی اور پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ یہ شاعرات ہر محاذ پر برائی کے خلاف، جمود، سکوت اور ظلم کے خلاف سراپا احتجاج تھیں۔ یہی شاعرات، آگے چل کر نسائی تحریک کی آواز ثابت ہوئیں۔ جن میں صفیہ شمیم، نجمہ تصدق، ادا جعفری، زہرا نگاہ، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔

ادا جعفری کے کلام آزادی سے قبل ملک کے مشہور رسائل و جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ جن میں ''شاہکار'' ''ادب لطیف'' اور ''ارمان'' کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان رسالوں کے ذریعہ وہ عوام تک نہ صرف رسائی حاصل کر چکی تھی بلکہ عوام وخواص میں مشہور بھی ہو چکی تھی۔

ادا جعفری کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا جس کا نام تھا ''میں ساز ڈھونڈتی ہوں''۔ یہ مجموعۂ کلام سکوت و جمود اور فرسودہ نظامِ زندگی کے خلاف اعلان بغاوت تھا۔ ان کے دل میں اس نظامِ زیست اور جمود کے خلاف ایک اضطراب اور بے چینی پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کا حل شاید ان کو خود بھی معلوم نہیں ہے۔ نظم احساس اولین میں یہی کیفیت طاری ہے نظم کا ایک بند دیکھیے!

ہائے یہ آرزو نا معلوم

ایک نالہ سنا ہے بے آواز

روح میں انتشار سا کیا ہے

دل کو یہ انتظار سا کیا ہے

ادا جعفری نے اس دور کے شعراء سے ہی نہیں شاعرات سے بھی الگ ایک راستہ اپنایا۔ ایک نئے طرز کی بنیاد رکھی جہاں تقلید پر تحقیق غالب ہے اور یہی خوبی ان کو دیگر شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے یہاں آہستگی اضطراب اور احتجاج ساتھ ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ بیزاری کا یہ انداز دیکھیے۔

جسم آسودہ سہی روح مگر بے تاب

ایک بے نام تغیر کے لیے

درد کی ٹیس سہی، لذت جاوید نہیں

نغمۂ امید نہیں

قہر ہے اف یہ تسلسل یہ تواتر یہ جمود

تبدیلیوں کی یہی بے چینی انہیں مائل بہ پرواز کرتی ہے ایک ایسے جہاں کے لیے جہاں نئی زندگی ہو نئے انداز ہوں نئے آہنگ ہوں، آزادی، مساوات اور مدارات ہوں۔ یہی تبدیلی کی خواہشات ان کی شاعری میں بغاوت کے عناصر کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ میں ساز ڈھونڈتی رہی میں ان کی نظم کا ایک انداز ملاحظہ ہو۔

زمین پہ شعلہ باریاں، فلک پہ گڑگڑاہٹیں

کہ سن رہے ہیں چشم و دل نظام نو کی آہٹیں

بہار بیت ہی چکی خزاں بھی بیت جائے گی

مگر میں ایک سوچ میں پڑی ہوں آج بھی

وہ میری آرزو کی ناؤ کھے سکے گا یا نہیں

نظامِ نو بھی مجھے ساز دے سکے گا یا نہیں

ادا جعفری جدید اردو شاعری کی پہلی شاعرہ ہیں ان سے قبل اگرچہ شاعرات ہی نہیں صاحب دیوان شاعرات بھی ملتی ہیں لیکن ان کا رشتہ کسی ایک جیتی جاگتی عورت سے نہیں رہتا تھا بلکہ وہ شہزادی، دیوی، گڑیا یا پرستارزادی ہوا کرتی تھیں جن کے متعلق پروین شاکر رقمطراز ہیں!

''پرانے وقتوں کی بیشتر کہنے والی عورتیں یا تو بیگمات اور شہزادیاں ہیں یا پھر ان کا تعلق بالا خانوں اور کوٹھوں سے ہے۔ ایک جیتی جاگتی living عورت ہمیں نہیں ملتی۔ یہ سانس لیتی ہوئی عورت ہمیں جدید شاعری میں دستیاب ہوتی ہے۔ ادا جعفری کے یہاں ادا جعفری سے یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔(۷۰)

ادا جعفری کا دوسرا شعری مجموعہ ''شہر درد'' کے نام سے آیا جس کا کینوس بہت ہی وسیع تھا اور ان کی شدت و کشمکش میں ایک استحکام اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ جس کے متعلق فیض احمد فیض لکھتے ہیں۔

ادا بدایونی جو ساز ڈھونڈتی رہی تھی غالباً ادا جعفری شہر درد میں ہاتھ آ گیا۔ ادا کے لہجے میں اب ایسا تیقن اور ان کی آواز میں ایسی تمکنت ہے جو شاعر کو جہد اظہار میں اپنا مقام ہاتھ آنے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔ ''شہر درد'' نہایت باسلیقہ اور باوقار مجموعہ ہے۔(۷۱)

ادا جعفری اپنے اس مجموعہ میں بہت ہی پر اعتماد پر عزم اور پر امید نظر آ رہی ہیں۔ ان کی مثبت سوچ اپنی ہم عصر شاعرات کو بھی دعوت تبلیغ دے رہی ہے۔ جس کا اندازہ ان کی نظم ''میراث آدم'' کے اس بند سے لگایا جا سکتا ہے۔

غم رسیدہ نہ ہو آبدیدہ نہ ہو

قافلہ تو ہمیشہ رہا تیز رو

ایک مشعل بجھی دوسری جل گئی

ایک مرجھا گئی اک کلی کھل اٹھی

وہ جو انسان ہیں

ایک کلی کے لئے اک کرن کے لئے

جاں لٹاتے رہے سر کٹاتے رہے

سچ کہو دوستو سچ کہو ساتھیو

تم نے انساں کو بھی مرتے دیکھا کبھی

اس کے دامن کو دستِ اجل چھو سکا

ادا جعفری اپنی شاعری میں صرف ایک محبوب کے کردار میں ہی دکھائی نہیں دیتی ہیں بلکہ وہ سماج کی ایک مہذب فرد کی طرح کبھی بہن کے پاکیزگی کے کردار میں ہیں کبھی ماں کے کردار میں ہیں تو کبھی ایک معلّمہ کے کردار میں اور ہر کردار میں وہ عمل کا درس دیتی ہیں فرار کا نہیں وہ اپنی تخلیق پر کبھی نازاں ہیں تو کبھی شرمندہ بھی۔ ماں کے کردار میں ان کا یہ انداز وگفتار ملاحظہ ہو۔

اپنی تخلیق پہ نازاں ہوں کہ شرمندہ ہوں

آگے کچھ دیکھنا بھی چاہوں تو وہم آتا ہے

اور سرگوشیاں کرتا ہے یہ ممتا کا جنوں

کٹ ہی جائے گا شبِ تار کا اک اور فسوں

دیکھ نادان ہے نادان سے مایوس نہ ہوں

آخر انسان ہے انسان سے مایوس نہ ہو

''غزالاں تم تو واقف ہو'' میں ادا جعفری کی شاعری میں اور نکھار دکھائی دیتا ہے اور یہ شاعری نسائی آواز سے اوپر اٹھ کر انسانی ارتقاء کی آواز بن گئی ہے۔ جہاں وہ رہ نوردِ شوق ہیں انہیں حرکت حرارت اور حسرت

میں جولذت ملتی ہے وہ منزل کے سکوت میں نہیں وہ اپنا درس آسان اور عام فہم زبان میں سناتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں۔ وہ نہ نفسیات کے الجھاؤ میں پڑتی ہیں اور نہ فلسفہ کی گہرائی و گیرائی میں نہ ان کی زبان فارسی زدہ ہوتی ہے اور نہ ہی ہندی آلودہ بلکہ وہ اپنا پیغام عوامی زبان میں دیتی ہیں اور یہی ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہے جہاں بغاوت، جسارت پر بھی عنانِ اعتدال ہے۔ نظم مسجد اقصیٰ میں یہی انداز ماضی کی عظمت اور انسانی عظمت کی تفسیر بیان کرتا ہے۔

زندگی مرگ عزیزاں کو تو سہہ جاتی ہے
مرگ ناموس مگر ہے وہ دہکتی بھٹی
جس میں جل جائے تو خاکسترِ دل بھی نہ ملے
اور تپ جائے تو کندن ہے وجود انساں
پھر یہ پگھلے ہوئے لمحات کراں تا بہ کراں
آپ مینارۂ انوار میں ڈھل جاتے ہیں
عرش سے خاک نشینوں کو سلام آتے ہیں

ادا جعفری کے بعد بالکل اسی انداز کی ایک اور شاعرہ زہرا نگاہ ہیں جنھوں نے نظمیں اور غزلیں دونوں کہیں لیکن نظمیہ انداز غزلیہ بیان پر حاوی ہے۔ ان کے یہاں بھی جذبات، احساسات، سیاسیات، سماجیات اور نسائی حسیات پر اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ لیکن وہ پژمردہ نہیں پر امید ہیں، ان کی آپ بیتی دراصل نسائی جگ بیتی ہے وہ جو کچھ بھی کہتی ہیں وہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی نقطۂ نظر سے ہے۔ ان کی پوری شاعری ہونے کی وجہ سے ان کی تخلیق میں بھی وہ تمام نشیب و فراز دیکھا جا سکتا ہے جو نسائی زندگی میں ملتا ہے کبھی دوشیزہ کے جذبات تو کبھی ان دیکھی خواہشات، کبھی دل کا درد تو کبھی بدن کا کرب، کبھی مکمل ہونے کا جذبہ تو کبھی استحصال کا دکھ، اپنا

گھر آنگن آباد ہونے کی خوشی تو ماں کا گھر آنگن چھوٹنے کا غم، آزادئ نسواں کا دل فریب طلسم، گھر کی ویرانی، دفتروں کی تیز مشینی، زندگی، ناخواندگی کے مسائل اور تعلیم کے وسوسے اور واہمے، قدیم عقیدے اور ہندی الفاظ کے ذریعہ وہ ماضی کی طرف لوٹنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کیونکہ انہیں اس چکاچوند روشنی میں بھی وہ تحفظ اور آسودگی نظر نہیں آتی جو ماں کے تنگ آنگن اور پست کمروں میں ملتی تھی نظم آنگن کا یہ پراثر انداز ملاحظہ ہو۔

کام کاج کا پلو ڈالے
دن بھر گھر سے الجھوں سلجھوں
رات کو لیکن آنکھیں موندے
پچھلی رات کا ساون دیکھوں
ہیرے لعل بکھرتے جائیں
محل دو محلے ہٹتے جائیں
چھوٹا آنگن نیچے کمرے
دور دور سے ہاتھ ہلائیں
جگمگ جگمگ سونے جیسا
گھر سب کی نظروں میں آیا
بھیگا آنچل پھیلا کاجل
کس نے دیکھا کس نے چھپایا

ان کا انداز نیا لیکن علامات قدیم ہیں انہوں نے کثرت سے میخانہ محتسب اور جام و مینا کا استعمال کیا

ہے۔ انہوں نے گھر آنگن کے دائرہ کو اس حد تک وسیع کیا کہ بین الاقوامی مسائل بھی ان کی شاعری میں دکھائی دینے لگے جہاں طلسم اور سمجھوتہ ہی نہیں بلکہ صلح اور امید بھی ہے۔ جس میں انسانیت چاند، ہوا اور سورج کی طرح آزاد اور منور ہے۔ نظم **''ایک بچے کا گیت''** یہی پیغام دے رہی ہے۔

کب کھیتوں میں دوڑ کے میں بھی ہوا کے جھونکوں کو چوموں گا

اور کب چاند کی ٹھنڈک کو میں اپنے ہاتھ سے چھو لوں گا

میں نے سنا ہے

مجھ کو یقیں ہے

اس دنیا میں سورج چاند ہوا پر کوئی قید نہیں

زہرا نگاہ اپنی شاعری میں نسائی بے وقعتی مایوسی، بے سروسامانی اور آزادی کے فریب پر نوحہ کناں ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم سوچتی ہوں اپنے راستے لوٹ جاؤں، ہمارے اور تمہارے راستوں میں، بن باس، تراشیدم، شکستم آج غمگین نہیں حیران ہیں ہم، گل چاندنی اور سمجھوتہ میں یہی کیفیت اور درد موجزن ہے۔

نظم سمجھوتہ کا یہ انداز دیکھیے۔

ملائم گرم سمجھوتے کی چادر

یہ چادر میں نے برسوں میں بنی ہے

اسی سے میں بھی تن ڈھک لوں گی اپنا

اسی سے تم بھی آسودہ رہو گے

نہ خوش ہو گے نہ پژمردہ رہو گے

زہرا نگاہ کے اس شعری اعتدال کے متعلق فیض احمد فیض رقمطراز ہیں۔

''ان منظومات میں نہ جدیدیت کے غیر شاعرانہ جذبات کا پرتو ہے اور نہ رومانیت کی شاعرانہ آدرش پسندی کا کوئی دخل ہے۔ روایتی نقش و نگار اور آرائشی رنگ و روغن کا سہارا لیے بغیر دل لگتا ہوا شعر کہنا بہت دل گردے کا کام ہے۔ (۷۲)

ادا جعفری اور زہرا نگاہ کے ہمعصر شاعرات میں ایک مشہور نام کشور ناہید کا ہے جن کی آمد تو گھونگھٹ میں لب گویا کے ذریعہ ہوئی جہاں ایک شرماتی ہوئی اور ہونٹ کپکپاتی ہوئی شرمگیں نگاہوں والی یہ لڑکی آنکھ اٹھانے سے بھی قاصر تھی اور صرف چہرہ ہی نہیں بلکہ ہاتھ بھی پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی کہ کہیں خواہشات بدن سے دنیا آشنا نہ ہو جائے اور راز دل فاش نہ ہو جائے اس لیے قدم قدم پر وہ سنبھل کر چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں

اور پھر جلد ہی یہ مہندی لگے ہاتھ نے یہ دعا مانگنی شروع کر دی۔

بچھڑ کے ملنے میں لذت سہی مگر ناہید
کبھی تو وصل مسلسل کا ہی عذاب تو دے

گھونگھٹ میں آنے والی اس معصوم لڑکی نے بہت جلد ہی صرف نقاب یا حجاب ہی نہیں اتارا بلکہ روایات کی در و دیوار ڈھا کر بغاوت کا اعلان بھی کر دیا اب اس کی شاعری میں نہ شرم و حیا ہے نہ کپکپاتے ہوئے ہونٹ ہیں اور نہ ہی خواہشات کی آگ دبی ہوئی ہے بلکہ ایک بغاوت، جسارت اور اعلان جنگ ہے جہاں فنا ہونا نہیں بلکہ فنا کرنا مقصود ہے، شخصیت کو پہچاننا نہیں پہچنوانا مقصود ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ پہلی شاعرہ ہے جس نے بغاوت کا اعلان کیا اپنی بات شیریں صاف اور ترنم آمیز جملے میں نہیں کہیں بلکہ کڑوے اور کسیلے

انداز میں کہا۔ان کی شاعری نسائیت کی پرچم کشائی ہے، برجستگی کا یہ انداز دیکھیے !

میں بدل ڈالوں وفاؤں کی جنوں سامانی

میں اسے چاہوں تو اپنی ہی خبر سے چاہوں

کشور ناہید کے مجموعہ کلام گلیاں دھوپ دروازے اور مسافتوں کے درمیان کی شاعری جب منظر عام پر آئی تو لوگوں کو اس میں ان کا ذہنی ارتقاء دکھائی دیتا ہے جس میں وہ نافہم اور ناآشنا نہیں بلکہ سب کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہیں یا سمجھ چکی ہیں۔

اب کچھ کچھ سمجھی ہے دنیا کو ناہید

اب کی بار نہیں مانی بہلانے سے

اب ان کی نظموں میں سرکشی، جسارت اور خود آگہی کی کوشش ہے۔ وہ کمزور، مجبور یا قسمت کے بھروسے نہیں بلکہ اپنی قوت، طاقت اور حشمت پر انہیں یقین واعتماد ہے وہ طرز کہن کا خاتمہ کر کے آئین نو کو رائج کرنا چاہتی ہیں اور یہی حساس عورت ان کی شعری شناخت ہے۔

نظم **''سلامت گہہ خواب''** کا یہ بند شاید یہی پیغام دے رہا ہے۔

اٹھو اور بھلا دو

وہ بے مہر ساعت

کہ جس نے بجھی خلوتوں کی سیاہی کو

حدت کی چندھیانے والی شعاعوں سے

پگھلے ہوئے برف کی شکل میں

بہہ نکلنے کے ہر راستے کو خر دزار سنگ ملامت سے اٹ کر

سلامت گہہ خواب کو روند ڈالا

کشور ناہید کی شاعری میں پنجابی اور انگریزی الفاظ کثرت سے ملتے ہیں جس کی وجہ سے نسائی لہجہ اور باغی انداز کو وہ موثر ڈھنگ سے پیش کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں لفظیات اور فنی نقطۂ نظر سے بھی تازگی اور نیاپن لیے ہوئے ہے جہاں تجربات کی ہم آہنگی بھی ہے اور فکری وسعت بھی۔ ان کی نظم آگہی، اثبات، میں کون ہوں، تیرا الٹیا شہر بھنبھور، نیلام گھر، خلوت، زخم، نائٹ میسر۔ اسی دے بریاں لوگو، میں یہی نسائی اور سیاسی درد بغاوت بن کر اٹھ رہا ہے جہاں وہ آخری فیصلہ میں آخری حد تک جانا چاہتی ہیں۔ یہ انداز ملاحظہ ہو۔

موجود سے انکار بھی
تو قتل کے مترادف ہوتا ہے
میرا جی کرتا ہے
وہ سب جو میرے قاتل ہیں
میں انہیں
ہوا کی طرح نگل جاؤں

کشور ناہید کی شاعری کی شدت اور پیچ و تاب کے متعلق پروفیسر شمیم حنفی لکھتے ہیں۔

''کشور ناہید کی شاعری نہ پڑھنے والے کو سکھ سادھن بہم پہنچاتی ہے اور نہ انہیں آسانی سے آگے جانے دیتی ہے۔ ایک موج مستقبل پاؤں کی زنجیر بن کر پڑھنے والوں کو اسی منڈپ میں کھینچ کر لے جاتی ہے جہاں ذات اور غیر ذات، سب کے سب تجربے ایک ہی مرکز پر یکجا نظر آتے ہیں اور فضا ایک مستقل اضطراب، ایک لازوال اندوہ اور ایک ہر لمحہ گہرے ہوتے ہوئے سرکشی کے جذبے سے بوجھل محسوس ہوتی ہے۔'' (۷۳)

فہمیدہ ریاض: فہمیدہ ریاض بھی ایک باغی شاعرہ کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی ہیں ان کا پہلا شعری مجموعہ پتھر کی زبان'' ہے۔ وہ پتھر ہی کی طرح خاموش بھی اور موم کی طرح نرم بھی ہیں جسمیں غنچگی کے احساسات و جذبات کارفرما ہیں۔ خواہش وصل، لطیف بدن، فداکاری بیوفائی، نارسائی، صبر وضبط، تسلیم ورضا، خوبصورت خواب، ہجر کی اذیت، وصل کی لذت، بدن کا آگ چکھنا، لبوں پر حرف نامکمل، پلکوں پر ستارے، خودسپردگی، آگہی، شب بیداری اس مجموعۂ کلام کی زینت ہیں اور نظم زادِراہ، لمبے سفر کی منزل، گڑیا میں آئندہ کی چمک اور موجودہ بے بسی اداسی اور نظام سے بے زاری کا ثبوت فراہم کرتی ہیں جہاں وہ مایوسی کی حالت میں یہ تمنا کرتی ہیں۔

نہ امید کوئی نہ کوئی سہارا
بغاوت کی ہمت نہ کوشش کا یارا
مری بے بسی مجھ پہ ظاہر ہے لیکن
تمہاری تمنا تمہاری تمنا

لیکن اس پتھر کی زبان نے جب اپنے وجود کو چٹ کرلیا تو اس کے اندر سے بدن دریدہ کی شاعری باہر آئی۔ جس نے پختہ شعور اور پختہ فن کے بل پر معاشرتی اور اخلاقی برائیوں اور پابندیوں پر دھاوا بول دیا۔ جہاں صرف بدن ہی دریدہ نہیں بلکہ زبان و بیان بھی دریدہ دکھائی دے رہے ہیں۔ جنہیں شرم و حیا کی چادر یا روایات کی دستار چپ نہیں رکھ سکتی۔ وہ مسلسل آزمائشوں سے گزرنے اور امتحانوں میں پڑنے پر اب تیار نہیں بلکہ مساوات چاہتی ہے اسے اپنی بے بسی پر صرف غصہ ہی نہیں بلکہ نفرت بھی ہے۔ نظم باکرہ کا یہ انداز عقل وخرد

کو حیران کر دے رہا ہے۔

اس کی ابلی ہوئی آنکھوں میں ابھی تک ہے چمک

اور سیہ بال ہیں بھیگے ہوئے خوں سے اب تک

تیرا فرمان تھا یہ اس پہ کوئی داغ نہ ہو

سو یہ بے عیب اچھوتا بھی تھا ان دیکھا بھی

بے کراں ریگ میں سب گرم لہو جذب ہوا

دیکھ چادر پہ مری ثبت ہے اس کا دھبّا

فہمیدہ ریاض نے جنسی تجربات کو موضوع سخن بنایا نسوانیت نے انہیں طاقت دی انہوں نے اپنے فن اور قلم کے بل پر بے اعتدالیوں اور ناانصافیوں کے جال کو تار تار کر دیا اور بیان کی آزادی جو صرف مرد تک ہی محدود تھی فہمیدہ ریاض نے کھل کر اس کا استعمال کیا۔ محبوب اور معشوق کی شکل میں بھی اور ماں کے کردار میں بھی نظم **''لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا''** میں یہ جسارت ان الفاظ میں ظاہر ہو رہی ہے۔

لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا

چھو کے میرا بدن

اپنے بچے کے دل کا دھڑکنا سنو

سب مقدس کتابیں جو نازل ہوئیں

سب پیمبر جو اب تک اتارے گئے

خیر کے دیوتا حسن، نیکی، خدا

آج سب پر مجھے

اعتبار آ گیا، اعتبار آ گیا

فہمیدہ ریاض کی شاعری کا دائرہ صرف نسائیت تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ زندگی کے ہر گوشے پر انہوں نے نظر رکھی، سماج کے ایک مہذب شہری کی طرح سماجی مساوات اور سیاسی خرافات پر بھی انہوں نے اپنے قلم کو جنبش دیا اور ان کی بیخ کنی کی۔ انہوں نے ارباب اقتدار کی ہوس اور فنکار کی اخلاقی پستی کو بھی ظاہر کیا۔ نظم ''**شہر والو، سنو!**'' میں یہی موضوع زیر بحث ہے۔ انہوں نے شخص، سماج، سیاست اور فریب کاریوں پر زہریلے انداز میں ردعمل کا اظہار کیا ہے۔

وہ عجب مملکت ہے

جانور جس پر مدت سے تھے حکمراں

گو رعایا کو اس کا پتا تک نہ تھا

اور تھا بھی تو بے بس تھے لاچار تھے

ان میں جو اہل دانش تھے مدت ہوئی مر چکے تھے

جو زندہ تھے بیمار تھے

فہمیدہ ریاض کا تیسرا شعری مجموعہ ''دھوپ میں سایہ'' ہی سایہ ہے۔ بدن دریدہ یہاں بدن آسودہ نظر آ رہا ہے۔ اس مجموعۂ کلام کی تمام نظموں میں ایک گہرائی اور ٹھہراؤ نظر آ رہا ہے۔ اس کی زبان و بیان میں اگر شیرینی نہیں تو کڑواہٹ بھی نہیں ہے۔ یہاں وہ نہ دوشیزہ ہیں اور نہ ڈائن بلکہ ایک مہذب عورت ہیں جس کے لب پر مسکراہٹ دل میں نرم جذبہ اور موج ہے اور کندھے پر ذمہ داریاں اور حالات سے لڑنے کی ہمت اور صلاحیت بھی ہے ایک لڑکی میں یہ مثبت سوچ ان الفاظ سے آراستہ ہے۔

سنگ دل رواجوں کے

خستہ حال زنداں میں

اک صدائے مستانہ

یہ عمارت کہنہ ٹوٹ بھی تو سکتی ہے

یہ اسیر شہزادی چھوٹ بھی تو سکتی ہے

فہمیدہ ریاض کی شاعری میں ہندی الفاظ کی بھرمار ہے کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو کی نہیں بلکہ ہندی کی شاعرہ ہیں۔ نظم مہاجر کا یہ ٹکڑا دیکھیے۔

کرودھ کپٹ سے بھرے بول

بول ہمارے بڑوں کے

اونچے اونچے کڑے بول

دھرتی کی ننگی چھاتی پر

ناچ رہے ہیں بڑے بول

فہمیدہ ریاض کی زبان، جسارت اور ذہن کے بارے میں نجمہ رحمانی رقمطراز ہیں۔

''انتہا پسندی فہمیدہ ریاض کا مزاج ہے۔ جس کا عکس شاعری کی سطح پر جھلکتا ہے۔ اسلوب میں تلخی آتی ہے تو اس حد تک کہ قاری کا ذہن بوجھل ہو جاتا ہے زبان میں ہندوستانیت آتی ہے تو اس طرح کہ کبھی کبھی اس کی مصنوعات گراں گزرنے لگتی ہیں۔'' (۴۷)

یاسمین حمید: ان شاعرات کی صف میں ایک منور چہرہ یاسمین حمید کا بھی دکھائی دیتا ہے جن کی شاعری میں عورت کی مکمل زندگی دیکھی جاسکتی ہے۔ جواب صرف محبوبہ، بیٹی، بہن، بیوی اور ماں ہی نہیں بلکہ وہ ادنیٰ خادم سے اعلیٰ آفیسر تک کے عہدہ پر فائز ہے لیکن اس نے اپنے جذبات واحساسات کا گلا نہیں گھونٹا۔ ان کی شاعری نسائیت کی ہر منزل کی ترجمانی کرتی ہے۔ جس میں انفرادی تجربات بھی ہیں، اجتماعی مشاہدات بھی، نفسیات کے پہلو بھی اور فلسفہ کی آمیزش بھی سماجی گھٹن بھی اور عشقیہ اشعار بھی، جدید علامات ولفظیات بھی اور قدیم روایات بھی، فحاشی سے گریز بھی اور مرد وزن کے تعلقات پر پاکیزہ اشعار بھی۔ یہی میانہ روی ان کی شعری شناخت ہے جہاں ہجر و وصال کا ایک لامتناہی سلسلہ ملتا ہے۔ جہاں اداسی اور تشنگی خوشی اور سیرابی پر غالب ہے۔ یہ شعر دیکھیے۔

بارش کے بعد مہرباں بادل گزر گئے
دھرتی بہت اداس ہے زخم وصال پر

احساس محرومی، ناکامی اور مایوسی جدید دور کا سب بڑا المیہ ہے۔ جہاں مشینی زندگی نے احساسات وجذبات کو پامال کرر کھا ہے۔ بے کیف زندگی کی بھیڑ میں ہر شخص خود کو تنہا محسوس کرر ہا ہے اور کسی کو کسی پر اعتماد نہیں جو جتنا زیادہ قریبی ہے۔ اس سے اتنا ہی زیادہ مایوسی ہے اور یہی تنہائی و مایوسی کی پیاس اس کی ہر خواہشات کو پامال کیے ہوئے ہے یاسمین حمید کے یہاں یہ پیاس پانی، کشتِ ویراں، زمین، چھاگل، نمی، بادل، قطرہ، سمندر اور اس کے متعلقات جیسی علامات کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے شعر دیکھیے۔

دھرتی اپنی نمی سے اپنے دامن کو بھر لیتی ہے
ہوا کا ساتھی کالا بادل بن ٹھہرے اڑ جاتا ہے

یاسمین حمید کے لہجے میں نسائی کسک کثرت سے پائی جاتی ہے۔ جہاں اسے نہ سمجھے جانے یا کم سمجھے

جانے کا درد ہے۔ جہاں عورت کو صرف فطری تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن نسائی کائنات صرف ان تقاضوں کا نام نہیں بلکہ اسے ذہنی آسودگی کے لیے اس محبت اور شفقت کی ضرورت ہے جس کا تعلق دل سے ہے جسم سے نہیں۔ یاسمین حمید اسی کیفیت کو بے باک انداز میں پیش کر رہی ہیں۔

آپ اندر کے موسم کو سمجھیں گے کیا
چہرہ دیکھیں گے اور بیچ بو جائیں گے

یاسمین حمید کا پہلا شعری مجموعہ ''پسِ آئینہ'' کی شاعری دراصل انہیں نسوانی جذبات اور احساسات کی عکاسی ہیں جہاں خواب کی خواہش، وفا کا جذبہ، ناآسودگی کی کسک بے اطمینانی کی کیفیت اور احتجاج کا دبادبا اور سنبھلا ہوا لہجہ ہے۔

میں ساتھ دیتی رہی کوئی فیض پاتا رہا
میری حیات کسی دوسرے کا بخت ہوئی

یاسمین حمید کا یہ انداز آہستہ آہستہ میر کی راتوں سے ملتا ہوا نظر آتا ہے جہاں کسک، بے اطمینانی اور مایوسی سایہ فگن ہے۔ یہ شعر دیکھیے۔

کوئی پر رونق شہر تو تھا نہیں
دل کھنڈر رہی تھا تباہی سہہ گیا

اور یہ دل کا کھنڈر جب کبھی آباد ہی نہیں ہوا تو پھر ہجر کی اذیت اسے کیوں ہوگی۔ جس نے وصل کا مزا ہی نہیں چکھا۔ شعر دیکھیے۔

جاؤ تم عادی ہے دل میرا ویرانوں کا
اس میں پہلے بھی کوئی رہتا نہیں تھا

یاسمین حمید کی یہ سوگوار کیفیت جدید نسوانی ذہن کی عکاسی کرتی ہے لیکن یہ اداسی، سوگواری، حادثات اور صدمات ان کو اب رنجیدہ نہیں کرتے بلکہ وہ عادی ہو چکی ہیں اور اس کو زندگی کا زیور تصور کرتی ہیں اور یہی وہ سوچ ہے جوان کو اس قدر مضبوط کر دیتی ہے کہ نہ وہ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہیں نہ راہ فرار اختیار کرتی ہیں اور نہ ہی خودکشی و خودسپردگی کے بارے میں سوچتی ہیں بلکہ اعتماد اور یقین کے ساتھ میدان عمل میں کود پڑتی ہیں۔ تب انہیں اپنی طاقت اور توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ شعر دیکھیے۔

آئی جب اس کے مقابل تو نیا بھید کھلا
مجھ کو اندازہ نہ تھا اپنی توانائی کا

یاسمین حمید کی شاعری صرف ذاتی تجربات کا نچوڑ نہیں بلکہ نسائی اجتماعیت کی داستان ہے جس میں نصیحت بھی ہے اور عبرت بھی۔ ان شاعرات کی صف میں زبیدہ حبیب، ممتاز مرزا، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، مسعودہ حیات، جمیلہ بانو اور پروین شاکر کا نام قابل ذکر ہے۔

جہاں پروین شاکر کا مرتبہ اپنی علمی اور شعری کاوشوں اور کوششوں کی وجہ سے سب سے بلند و برتر ہے جن کی شاعری میں ادا جعفری کی ادا، زہرا کی نگاہ، کشور ناہید کا احتجاج، فہمیدہ ریاض کا فہم، ممتاز مرزا کی روایات، زیدی کی تلاش، جمیلہ کی رَوانی اور مسعودہ حیات کی تقلید یکجا ہے۔ اس طرح پروین شاکر کی شاعری کی بساط پر ان تمام شاعرات کی خوبیاں نجوم و کواکب بن کر جگمگا رہی ہیں۔ پروین شاکر کی شاعری اور شخصیت کا خوبصورت خاکہ اشفاق احمد ورق نے خوشبوؤں کی شاعرہ کے عنوان سے لکھا ہے جو اس طرح ہے۔

''اس دنیا میں غزل کی وجہ آغاز عورت اور عورت کی وجہ آغاز مرد ہے اور اب یہ تینوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو مردوں کے ساتھ خواتین شاعرات کی بھی کمی نہیں مگر ان میں سے اکثر کے ہاں شاعرہ بولتی ہے تو عورت غائب ہو جاتی ہے اور عورت کی آواز سنائی دیتی ہے تو

شاعرہ پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ یہ پہلی خاتون شاعرہ ہے جس کے ہاں عورت اور شاعرہ قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ پروین شاکر کو زبان پر پوری گرفت ہے۔ اردو زبان پر بھی اور اپنی زبان پر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ اور اشارات اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں جو چاہتی ہے لکھ دیتی ہے لوگ بھی وہی چاہتے ہیں جو لکھ دیتی ہے۔'' (۷۵)

حوالاجات

نمبرشمار	نام کتب ورسالہ	مصنف-مؤلف، ومرتب	صفحہ نمبر
۱:	تاریخ ادب عربی	سید طفیل مدنی	۱۳۳
۲:	عربی ادب کی تاریخ	عبدالعلیم ندوی	۲۰۸
۳:	سرسید میگزین علیگڑھ		۶۰
۴:	دیوان شمیم العراء		۸
۵:	معارف اعظم گڑھ		۲۰۳
۶:	الموجز تاریخ الادب السعودی		۲۷۰
۷:	ادب المراۃ السعودیہ		۲۰۳
۸:	ادب المراۃ		۷۴
۹:	شبلی میگزین اعظم گڑھ		۱۲۹
۱۰:	الندوہ جلد ۵ نمبر ۳		۱۷۰
۱۱:	بزم تیموریہ		۲۴۱
۱۲:	تزک جہانگیری		۱۱۴
۱۳:	بزم تیموریہ		۲۴۳
۱۴:	مراۃ الخیال		۱۲۸
۱۵:	ید بیضا،	آزاد بلگرامی قلمی نسخہ دارالمصنفین اعظمگڑھ	
۱۶:	بزم تیموریہ		۲۶۳
۱۷:	مقالات شبلی جلد پنجم		۱۱۶
۱۸:	عصری فارسی شاعری وشعراء		۲۳۸

۱۹:	عصری فارسی شاعری وشعراء	۳۹۴
۲۰:	عصری فارسی شاعری وشعراء	۳۹۷
۲۱:	بہارستان ناز	۱۲۲
۲۲:	تذکرہ الخواتین	۴۶
۲۳:	تذکرہ نسواں ہند	۱۹
۲۴:	تذکرہ شمیم سخن	۷
۲۵:	اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک	۲۴۱
۲۶:	معاصر لاہور	۴۷
۲۷:	اردو غزل کی ماہ تمام پروین شاکر	۹
۲۸:	خوشبوؤں کی شاعرہ پروین شاکر	۳۵
۲۹:	معاصر لاہور	۳۸۸
۳۰:	معاصر لاہور	۳۸۹
۳۱:	معاصر لاہور	۴۵
۳۲:	روزنامہ سیاست حیدرآباد	۳
۳۳:	سہ ماہی اسباق	۱۰
۳۴:	قومی آواز بمبئی	۷
۳۵:	ماہنامہ شاعر شمارہ نمبر ۱۲	۱۷
۳۶:	خوشبوؤں کی شاعرہ پروین شاکر	۴۷
۳۷:	قومی آواز	۷
۳۸:	خوشبوؤں کی شاعرہ پروین شاکر	۳۷
۳۹:	سہ ماہی اسباق	۱۵

۴۰: سہ ماہی اسباق ۵۲

۴۱: سہ ماہی اسباق ۵۳

۴۲: سہ ماہی اسباق ۴۸

۴۳: خوشبوؤں کی شاعرہ پروین شاکر ۱۹

۴۴: اردو غزل کی ماہ تمام پروین شاکر ۲۴

۴۵: خوشبوؤں کی شاعرہ پروین شاکر ۴۹

۴۶: شب خون ۴۰

۴۷: آجکل دہلی ۲۰

۴۸: پیش لفظ دریچہ گل ۱۸

۴۹: عصری ادب خواتین نمبر ۲۰۴

۵۰: آخری گھڑے کا پانی ۱۳۶

۵۱: معاصر لاہور ۳۸۲

۵۲: معاصر لاہور ۹۴

۵۳: دیباچہ صد برگ ۵

۵۴: آجکل دہلی ۴۵

۵۵: رزق ہوا ۱۳

۵۶: پاکستان میں اردو غزل ۷۸

۵۷: سہ ماہی اسباق ۴۷

۵۸: آزادی کے بعد اردو شاعرات ۹۸

۵۹: معاصر لاہور ۷۱

۶۰: معاصر لاہور ۸۰

۶۱: آزادی کے بعد اردو شاعرات ۹۶

۶۲: معاصر لاہور ۳۸۵

۶۳: معاصر لاہور ۳۹۸

۶۴: معاصر لاہور ۳۹۴

۶۵: معاصر لاہور ۳۹۵

۶۶: عصری ادب خواتین نمبر ۳۰۷

۶۷: آزادی کے بعد اردو شاعرات ۱۰۲

۶۸: معاصر لاہور ۳۹۰

۶۹: تاریخ ادب اردو ۱۶۰

۷۰: اردو غزل کی ماہ تمام پروین شاکر ۲۹

۷۱: آزادی کے بعد اردو شاعرات ۶۹

۷۲: شام کا پہلا تارا ۸

۷۳: رات کے مسافر ۹۵

۷۴: آزادی کے بعد اردو شاعرات ۱۱۶

۷۵: معاصر لاہور ۳۵۱

کتابیات

نمبر شمار	نام کتب و رسالہ	مصنف-مؤلف، ومرتب	ناشر	سن اشاعت
۱:	بدن دریدہ	فہمیدہ ریاض	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۸۳ء
۲:	بوئے سمن	مسعودہ حیات	رانی کتاب گھر	۱۹۸۰ء
۳:	بہارستان ناز	فصیح الدین	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۸۰ء
۴:	پاکستان میں اردو غزل	عقیل معین الدین	مکتبہ ابلاغ	۱۹۸۱ء
۵:	پس آئینہ	یاسمین حمید	مکتبہ ابلاغ	۱۹۸۳ء
۶:	پتھر کی زبان	فہمیدہ ریاض	مکتبہ جامعہ	۱۹۸۳ء
۷:	تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	درج نہیں
۸:	تذکرہ شمیم سخن	صفا عبدالحئی	نول کشور پریس	۱۸۹۱ء
۹:	تذکرۃ الخواتین	آسی عبدالباری	,, ,, ,,	
۱۰:	تذکرۂ نسوانِ ہند	بلخی فصیح الدین	,, ,, ,,	۱۹۶۰ء
۱۱:	شاعرات اردو	جمیل احمد	قومی کتب خانہ	۱۹۴۹ء
۱۲:	شام کا پہلا تارا	زہرا نگاہ	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۸۰ء
۱۳:	رات کے مسافر	انور سجاد (مرتب)	نئی آواز دہلی	۱۹۸۷ء
۱۴:	خطبات گارساں دتاسی	انجمن ترقی اردو	اورنگ آباد	
۱۵:	خوشبو	پروین شاکر	شان ہند پبلیکیشن	۱۹۸۸ء
۱۶:	خودکلامی	پروین شاکر	مکتبہ فنون لاہور	۱۹۸۵ء
۱۷:	دائروں میں پھیلی ہوئی لکیر	کشور ناہید	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۸۷ء
۱۸:	دھوپ	فہمیدہ ریاض	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۸۴ء

١٩: سازِ سخن   ادا جعفری   مکتبہ جامعہ دہلی   ١٩٨٩ء

٢٠: میں ساز ڈھونڈتی   ادا جعفری   نیا ادارہ لاہور   ١٩٩٠ء

٢١: صد برگ   پروین شاکر   شانِ ہند پبلیکیشن   ١٩٨٨ء

٢٢: غزل کے نئے جہات   سید محمد عقیل   ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس   ١٩٩٠ء

٢٣: آزادی کے بعد اردو شاعرات   نجمہ رحمانی   بھارت آفسیٹ پریس دہلی   ١٩٩٤ء

٢٤: اردو غزل کی ماہ تمام پروین شاکر   ڈاکٹر روبینہ شبنم   بھارت آفسیٹ دہلی   ٢٠٠٤ء

٢٥: پروین شاکر کی نظمیہ شاعری   ڈاکٹر روبینہ شبنم   بھارت آفسیٹ دہلی   ٢٠٠٥ء

٢٦: دیوان شمیم الغراء   غادۃ الصحرا   البیروت پریس   ١٩٦٤ء

٢٧: بزم تیموریہ   سید صباح الدین عبدالرحمٰن   معارف پریس اعظم گڑھ   ١٩٧٠ء

٢٨: ید بیضا   آزاد بلگرامی   قلمی نسخہ دار المصنفین اعظم گڑھ

٢٩: مقالات شبلی   سید سلیمان ندوی   معارف پریس اعظم گڑھ   ١٩٦٦ء

٣٠: تزک جہانگیری   جہانگیر   نول کشور پریس لکھنؤ   ١٨٨٢ء

٣١: تاریخ ادب عربی   سید طفیل مدنی   کونسل فروغ اردو دہلی   ١٩٨٥ء

٣٢: عربی ادب کی تاریخ   عبدالعلیم ندوی   کونسل فروغ اردو دہلی   ١٩٩٠ء

٣٣: ماہ تمام پروین شاکر   ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ   ٢٠٠٢ء

٣٤: دیوان خنساء   المطبع الوطنیہ، مصر   ١٣٠٥ھ / ١٩٨٨ء

٣٥: ادب المراۃ السعودیۃ   مولف عبدالکریم   جدہ   ١٩٧٠ء

٣٦: بنت الارض   ڈاکٹر فاتنہ شاکر   جدہ   ١٩٤١ء

٣٧: عواطف النسائیہ   ڈاکٹر مریم بغدادی   جدہ   ١٩٥٥ء

٣٨: الاوزان الباکیۃ   ثریا قابل   سعودی   ١٩٦٣ء

٣٩: عاشق اللیل   نازک الملائکہ   بغداد عراق   ١٩٤٧ء

۴۰: اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک | قاضی مشتاق احمد | مکتبہ جدید نئی دہلی | ۲۰۰۲ء
۴۱: عصری فارسی شاعری اور شعراء | سید احسن الظفر | نامی پریس لکھنؤ | ۱۹۸۹ء
۴۲: جای پا | سیمین بہبہانی | تہران ایران | ۱۹۵۲ء
۴۳: چلچراغ | سیمین بہبہانی | تہران ایران | ۱۹۵۵ء
۴۴: آتش و آب | پروین دولت آبادی | ایران | ۱۹۵۶ء
۴۵: اسیر | فروغ فرخزاد | ایران | ۱۳۳۴ھ/۱۹۵۶ء
۴۶: تولادیگر | فروغ فرخزاد | تہران ایران | ۱۹۶۷ء

اخبار و رسائل

نمبر شمار	نام رسالہ	ماہ	سن اشاعت
۱:	عصری ادب خواتین	اپریل تا اکتوبر	۱۹۸۰ء
۲:	سہ ماہی اسباق	فروری-ستمبر	۱۹۹۵ء
۳:	آجکل دہلی	ستمبر	۲۰۰۴ء
۴:	معاصر لاہور	دسمبر	۱۹۹۶ء
۵:	شبلی میگزین	سالانہ	۲۰۰۴ء
۶:	الندوہ جلد نمبر ۵ نمبر ۳		۱۹۶۵ء
۷:	معارف اعظم گڑھ	اکتوبر	۱۹۹۹ء
۸:	ماہنامہ شاعر	شمارہ نمبر ۱۲	۲۰۰۳ء
۹:	قومی آواز بمبئی	اگست	۱۹۸۲ء
۱۰:	شب خون الہ آباد	جون	۲۰۰۴ء
۱۱:	روزنامہ سیاست حیدر آباد	۲ر اپریل	۱۹۷۸ء
۱۲:	سرسید میگزین علیگڑھ	سالانہ	۱۹۸۹ء
۱۳:	شبلی کالج میگزین اعظم گڑھ	سالانہ	۲۰۰۵ء
۱۴:	آجکل دہلی	ستمبر	۱۹۹۶ء
۱۵:	کتاب نما جلد نمبر ۳۰ شمارہ نمبر ۴		۱۹۹۰ء
۱۶:	آجکل دہلی	ستمبر	۱۹۹۴ء
۱۷:	رسالہ ہمایوں		۱۹۵۵ء
۱۸:	اقدار (اردو سہ ماہی) جلد اول شمارہ اول	جنوری تا مارچ	۲۰۰۱ء

۱۹:	سہ ماہی نخلستان (خواتین نمبر) جے پور	جنوری تا مارچ	۲۰۰۰ء
۲۰:	ماہنامہ شمع	مئی	۱۹۹۵ء
۲۱:	آجکل دہلی	مارچ	۱۹۹۵ء
۲۲:	آجکل دہلی	نومبر	۲۰۰۵ء